MAY
2023

جدیدترادب کااشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

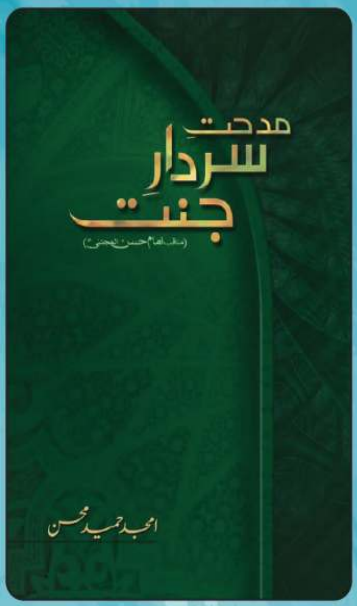

تحقیقی و تخلیقی زاویے
ڈاکٹر نثار ترابی

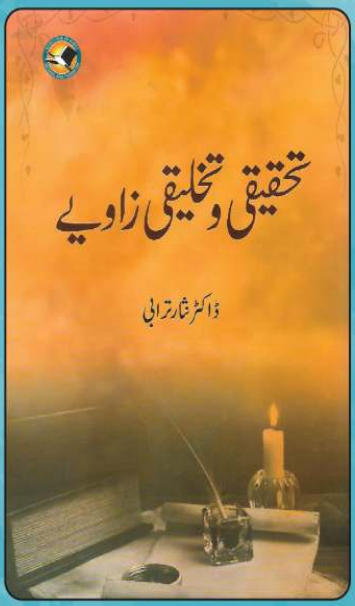

مدحتِ
سردارِ
جنت
امجد حمید محسن

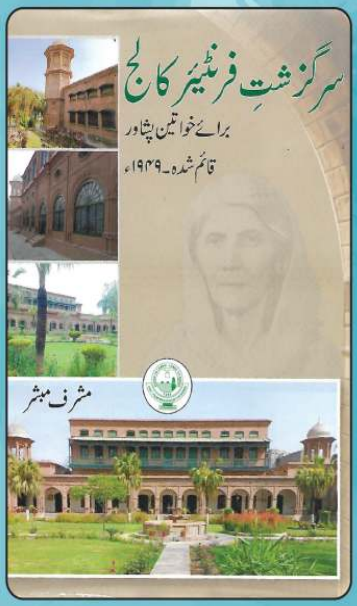

اُردو فلمی شاعری کا
عروضی تجزیہ
آفتاب خان

سرگزشتِ فرنٹیئر کالج
برائے خواتین پشاور
قائم شدہ ۔ ۱۹۴۹ء
مشرف مبشر

غزل

کیا کہوں شہرِ غزالاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا
جانِ جاں ! میں نے یہ زنداں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

رات یُوں چشم کشا تھا مرا ہر موئے بدن
جیسے میں نے ، تجھے اے جاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

اب لہو بن کے بھٹک تو میری شریانوں میں
اے گماں ، تو نے یہ امکاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

حکمراں یوں میری وحشت رہی مجھ پر ، شب بھر
میں نے گویا مہِ ہجراں کبھی دیکھا نہ تھا

تیری قربت کے سبھی عکس مرے قیدی تھے
تُو نے اے جاں ، پسِ مژگاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

رات کا کذب ، مجھے صدقِ سحر لگتا ہے
میں نے یوں شہرِ چراغاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

صبح ٹوٹا تری آنکھوں کی چمک کا جادو
نمِ تاباں! تجھے گریاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

دستکیں دیں ، دل آوارہ نے دَر دَر خالد
حیرتی نے یہ بیاباں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-6
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شذرہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - مئی 2023 - شمارہ نمبر: 5

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ

www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر رائے ونڈ روڈ ملحقہ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی	7
2	نعت	جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، خاور اعجاز، خورشید ربانی، نثار ترابی	8 تا 13
3	عقیدت	محمد یٰسین بھٹی	14
4	رباعیات	گلزار بخاری، خالد علیم	15 تا 16
5	مضامین	سلمیٰ اعوان، پیروز بخت قاضی، شاہین مفتی، نیلما ناہید دُرانی، غافر شہزاد، محمد اشرف کمال، فیصل زمان چشتی، نیر قریشی، نبیل احمد نبیل، صدام ساگر، سیدہ آمنہ ریاض، آصفہ باجوہ، محمد علی ایاز	17 تا 74
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	75 تا 83
7	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، راحت سرحدی، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، گلزار بخاری، اسلام عظمی، جمشید چشتی، اقبال سردیہ، اکرم سحر فارانی، منظور ثاقب، رخشندہ نوید، عقیل رحمانی، اشرف نقوی، زبیر فاروق، فرحت زاہد، مسعود احمد	84 تا 168

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	احمد جلیل، ظہور چوہان، افتخار شاہد، نعیم رضا بھٹی، اعجاز دانش ریاض ندیم نیازی، میتھیو محسن، سجاد بلوچ، عنبرین صلاح الدین شوکت محمود شوکت، اعجاز روشن، فیض رسول فیضان، علی حسین عابدی آصف شفیع، محمد سلیم ساگر، آفتاب خان، انصر حسن، اکرم ناصر ذکی طارق، افتخار شوکت، اکرم جاذب، علی رضا احمد، محمد اشفاق بیگ شاہد اشرف، آفتاب محمود شمس، علمدار حسین، محمود کیفی رضا اللہ حیدر، عاصم بخاری، عاطف جاوید عاطف، اسد اعوان عطا العزیز، محمد افضال انجم، امجد بابر، اصغر علی بلوچ، رخسانہ سمن عمران اعوان، ذوالفقار عادل، عروج درانی، عطاالحسن، عنبرین خان زبیر خیالی، راجہ عبدالقیوم، انور شیرازی، اسد رضا سحر، تاثیر جعفری سمیرا یوسف، کوکی گل، علی رضا بلوچ، احمد محمود، سرفراز عارض بشیر احمد حبیب، عقیل عباس، زاہد خان، عثمان حنیف، حسن ابن ساقی رانا محمد شاہد، ذوالفقار شاذ، شعیب عدن، ماہم حیا صفدر، نائلہ راٹھور مستحسن جامی، کشور عدیل جعفری، شہاب اللہ شہاب، ثمر جمال	84 تا 168
8	افسانے	ابدال بیلا، بلقیس ریاض، سیما پیروز، حبیب الرحمٰن اقبال خان یوسف زئی، آشا تھ کنول، نازیہ نور محمد شاہد محمود، عاصم بخاری	169 تا 209
9	طنز و مزاح / خاکے	نور کمال شاہ، محمد کلیم، سیدہ آمنہ ریاض	210 تا 219
10	نظمیں	خالد احمد، آصف ثاقب، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر گلزار بخاری، یونس خیال، فرخندہ شمیم، اکرم سحر فارانی رخشندہ نوید، نیاز جیراجپوری، شاہین عباس، زعیم رشید صغیر احمد صغیر، امجد بابر، حسن پرویز سیّد، نائلہ راٹھور، اعجاز رضوی	220 تا 238
11	خطوط	نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی، فیض رسول فیضان	239 تا 241

حمد

یہ زمیں اور فلک، کون و مکاں ہیں تیرے
بحر و بر، شمس و قمر اور زماں ہیں تیرے

سب فرامین کا اطلاق ہوا ہے ہم پر
حکم مطلق سبھی قرآں میں بیاں ہیں تیرے

ہم پہ کھلتے گئے اسرارِ جہاں بھی یارب!
جو حقائق ہیں وہی ہم پہ عیاں ہیں تیرے

تیری آیات نمایاں ہیں یہ دیکھا ہم نے
جتنے آثار نظر آئے نشاں ہیں تیرے

اپنے ہونے کی خبر تو نے ہی دی ہے ہم کو
کارواں صبحِ ازل سے ہی رواں ہیں تیرے

جذبۂ عشق سلامت کہ ہے جاں دینا ادا
ہو گئے تجھ پہ جو قربان، جہاں ہیں تیرے

حرفِ کن تیری رضا کا ہے اشارہ جیسے
استعارے بھی خدا سرِّ نہاں ہیں تیرے

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

زندگی آج بھی محرومِ معانی ہوتی
اِس میں شامل جو نہ سیرت کی کہانی ہوتی

اُسؐ کی توصیف سے جو خود کو اجالے ہوئے ہو
وہ عبارت نہیں تا حشر پرانی ہوتی

سایۂ ابرِ یقیں بار میں خود آ جاتے
کفر کی آگ جنہیں دل سے بجھانی ہوتی

پار ہرگز نہ زمینیں نہ زمانے کرتی
اُسؐ کی تحریک اگر صرف مکانی ہوتی

اُسؐ سے نسبت بھی ہے اعزاز ہمارا لیکن
اُسؐ کے وصفوں کی بھی کچھ ہم میں نشانی ہوتی

اب بھی رکھتا اُسی مینارِ ہدایتؐ پہ نظر
یہ زمیں خُلد جو انساں کو بنانی ہوتی

راکھ کر دیتا کڑے وقت کا سورج عالی
سر پہ اُس نامؐ کی چھتری جو نہ تانی ہوتی

جلیل عالی

نعتؐ

اذن خدا سے، ذوق ہنر میں نعت کا نور
روزن چشم روح کے اندر آیا نعت کا نور

آپؐ کے نور سے روشن ہے تخلیق کا ہر امکان
آپؐ کے نقش قدم سے ایسا پھوٹا نعت کا نور

سب نبیوں کو آپؐ کی نسبت کا اعزاز ملا
روز ابد تک قائم رہے گا زندہ نعت کا نور

جب بھی آپؐ کے لطف و کرم کا پھیلا سر پر سایہ
چھم چھم ابر رحمت نے برسایا نعت کا نور

ایک ایک کر کے سب تشکیک کے چہرے مسخ ہوئے
اور یقین کا قلب کے اندر نکھرا نعت کا نور

شعر و ادب کا لہجہ بدلا، تازہ ہیں افکار
کام ریاض کے آیا ہے یہ اجلا نعت کا نور

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزّت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیّت لکھی

نعتؐ

عشقِ نبیؐ کے دل میں ہیں جذبات موجزن
بے ساختہ ہیں لب پہ مناجات موجزن

اپنی زباں میں صلِ علیٰ کہہ رہی ہے یہ
ہے میری چشمِ نم بھی مرے ساتھ موجزن

ہر لحہ سیلِ اشک رواں کیوں نہ ہو، کہ جب
یادِ نبیؐ سے دل میں ہے برسات موجزن

نُورِ مدینہ دل میں ہے روشن، تو ہے یقیں
اِس میں نہ ہو سکے گی سیہ رات موجزن

سب کچھ بھلا دیا ہے مجھے اُنؐ کی یاد نے
کیوں ذہن و دل میں اب ہوں حکایات موجزن!

جب تک ہُوں اُنؐ کی چشمِ کرم کے حصار میں
ہو پائے گی نہ گردشِ حالات موجزن

مدحِ نبیؐ جو لکھنے لگا مَیں تو ہو گئے
ہر لفظ میں حروفِ تحیات موجزن

سب کچھ عطا ہوا وہ ہمیں آپؐ کے طفیل
جو ہے درونِ ارض و سماوات موجزن

گزرے جو اُنؐ کے در پہ درود و سلام میں
رہتے ہیں مجھ میں اب وہی لمحات موجزن

ہم کو جو ہو قرینۂ قرأت تو بات ہے
لہروں کی شکل میں بھی ہیں آیات موجزن!

مَیں کیوں نہ اُنؐ کے عہد میں پیدا ہوا نسیم
ہر دم ہیں دل میں بس یہ خیالات موجزن

نسیمِ سحر

نعتؐ

دیکھنے میں یہ زمیں رشکِ جناں معلوم ہو
وہؐ جہاں رکھیں قدم وہ آسماں معلوم ہو

روضۂ اقدس کے پہلو میں کئی انوار ہیں
ذرّہ ذرّہ اس جگہ کا کہکشاں معلوم ہو

قریۂ احمدؐ میں بیٹھے تو وجود اپنا ہمیں
بے نشاں ہوتے ہُوئے بھی بے کراں معلوم ہو

مسجدِ نبوی کا ہر حصہ ہے یوں تو لاجواب
روضۂ اطہرؐ مگر جنت نشاں معلوم ہو

عرض کرنا چاہتا تھا کچھ مگر ایسے لگا
جیسے اُنؐ کو پہلے سے میرا بیاں معلوم ہو

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر لفظ چاہتا ہے کہ اُس ذکر میں ڈھلے
دَر پر ہیں دست بستہ بتانِ سخن تمام

نعتؐ

یہ خیر خواہیِ امت نشانِ رحمت ہے
"حضورؐ آپ کا اُسوہ جہانِ رحمت ہے"

کھلا ہے بابِ عطا دوست ہو کہ دشمن ہو
یہ شانِ فضل و کرم ہے، یہ شانِ رحمت ہے

وہ آفتابِ قیامت، یہ دھوپ دنیا کی
خوشا کہ سایۂ دامانِ جانِ رحمت ہے

سجائے حرف بھی مضمون بھی وہی بخشے
یہ نعت گوئی عطائے بیانِ رحمت ہے

خورشید ربانی

"ہر شعبۂ حیات میں امکانِ نعت ہے"
مجھ کو بھی ایک عمر سے ارمانِ نعت ہے
شہرِ سخن میں نوکری ملتی ہے بخت سے
اور آرزو ہماری قلم دانِ نعت ہے
اُس پر سخن سرائی کے اسرار کھل گئے
جس کو نصیب نعمتِ عرفانِ نعت ہے
گلزارِ مدحِ رحمتِؐ عالم کروں ہوں سیر
ایمان کی کہوں تو یہ احسانِ نعت ہے
داؤد وش کو زیبا ہیں نغمہ سرائیاں
دیکھو یہ گلستان ، گلستانِ نعت ہے

خطا کے دشت میں بھٹکے ہوئے مسافر کا
ٹھکانہ ہے تو فقط گلستانِ رحمت ہے

کلامِ پاک ہے سیرت رسولِؐ اکرم کی
رسولِؐ پاک کا فرماں بیانِ رحمت ہے

ہوا ہے حاتمِ طے نامور سخاوت میں
مگر جو فیض رساں خاندانِ رحمت ہے

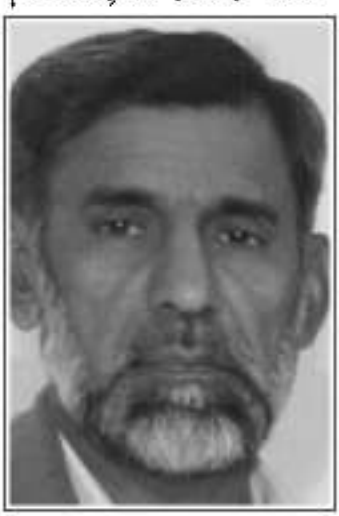

ہر شاخِ لب پہ پھول کھلے ہیں درود کے
ہر دل میں پُربہار خیابانِ نعت ہے
فریاد رس! میں، طالبِ خیراتِ لطف ہوں
لیکن یہ استغاثہ بہ عنوانِ نعت ہے
اک بے ہنر کو فکر ہے مضمونِ تازہ کی
اک بے ہنر کے ہاتھ میں سامانِ نعت ہے

نعتؐ

رہبرِ دوسرا بس آپؐ ہیں ، بس آپؐ ہیں
منزلوں کا آسرا بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

از ابد تا انتہا ملتی نہیں جس کی مثال
وہ عطائے بے بہا بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

تا ابد ہم عاصیوں کو ہے سہارا آپؐ کا
حشر تک خیرالوریٰ بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

سربسر جُود و سخا کی رفعتوں کا معجزہ
سربہ سر صِدق وصفا بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

آپؐ سے تعبیرِ انساں ، آپؐ سے تکمیلِ دیں
رہنمائے حق نُما بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

شافعیٔ محشر بھی ہیں ، فخرِ دو عالم بھی ہیں
اور ختم الانبیاء بس آپؐ ہیں ، بس آپؐ ہیں

نثار ترابی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیٹھے ہیں اُن کے دَر سے لگے سر دَر آستیں
دیدہ ورا تمام ، دریدہ دہن تمام

عقیدت

اک حسرتِ خوش گام جگا لوں مرے آقاؐ
مَیں بھی تو کبھی بگڑی بنا لوں مرے آقاؐ

ہُوں آپ کی رحمت کے طلبگاروں میں شامل
دامن کو عذابوں سے بچا لوں مرے آقاؐ

شاید کہ ملے مجھ کو بھی تعبیرِ تمنا
آنکھوں میں کوئی خواب چھپا لوں مرے آقاؐ

گر اِذنِ حضوریؐ ہو تو آ جاؤں مدینہ
مَیں اپنے مقدّر کو سجا لوں مرے آقاؐ

خوشبو سے مہکتا رہوں یٰسین ہمیشہ
اِک شہرِ عقیدت جو بسا لوں مرے آقاؐ

محمد یٰسین بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ماحیؐ غمِ دل و دنیا! تیرے لیے
محوِ دعا رہے رُسلِ ذوالمنن تمام

رباعیات

حق حمد سرائی کا ادا کیسے ہو
اظہار تحیر کے سوا کیسے ہو
ہم وصف محمدؐ کے نہیں گن سکتے
محمود کی توصیف و ثنا کیسے ہو

.....

مندر کا مکیں پائے صنم چومتا ہے
کعبے کا محب سنگِ حرم چومتا ہے
جس عرش کے بوسے کی ہے خواہش سب کو
وہ صرف محمدؐ کے قدم چومتا ہے

.....

تفضیل کے ہر باب میں اکمل ٹھہرے
کردار میں گفتار میں افضل ٹھہرے
کہتا ہے یہی ماہِ ربی الاوّل
آخر میں بھی آ کر وہی اوّل ٹھہرے

.....

جی روزِ ازل سے وہیں لاگا ہوا ہے
احساس بھی پندار بھی جاگا ہوا ہے
رمضان کے دن نعتِ نبی کی باتیں
گلزار یہ سونے پہ سہاگا ہوا ہے

.....

امرت ہو کہ زہر اس میں سبو بولتا ہے
ہر حال میں ظرفِ من و تو بولتا ہے
چھپتے نہیں دنیا میں حسین اور یزید
جیسا بھی کسی کا ہو لہو بولتا ہے

.....

بے شک ہمیں صابر بھی کہا جاتا ہے
حد تک ہی مگر جبر سہا جاتا ہے
مرگِ سگِ دنیا جو شہادت ٹھہرے
خاموش کہاں ہم سے رہا جاتا ہے

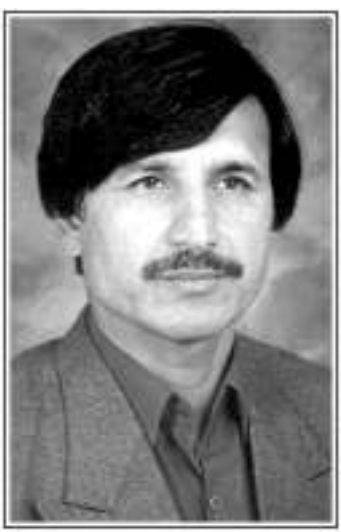

گلزار بخاری

رباعیات

ممکن نہیں عنصر کا سوا ہو جانا
تقدیر کے پنجے سے رہا ہو جانا
ہر شے کے وجود سے ہے دنیا کا وجود
دنیا کا نصیب ہے فنا ہو جانا

.....

دنیا کا نظر میں جب سراپا اُترے
سوچوں کا تراشا ہوا چہرہ اُترے
ممکن ہی نہیں یہ کسی صورت خالد
تیرے معیار پر یہ دنیا اترے

.....

انساں کے وجود کی فنا پر ہے اساس
آئینۂ التباس ہے عقل و حواس
معمورۂ آب و گل ہے، دنیا کیا ہے
عرفانِ حیات کیا ہے، سب وہم و قیاس

.....

چکر میں ہے آسمان، گردش میں زمیں
منظر کوئی آنکھ میں ٹھہرتا ہی نہیں
ہر لحظہ بدل رہا ہے مفہومِ حیات
دل کی دھڑکن نہ بند ہو جائے کہیں

.....

خالد رگِ جاں میں گردشِ سم کیا ہے
یہ آنکھ میں تیرتا ہوا نم کیا ہے
کیا گھوم رہا ہے میرے چاروں جانب
اُتر، دکھن، پُورب، پچھم کیا ہے

ماضی گم ، حال گم ، کہیں فردا گم
صحرائے عدم میں ہو گیا کیا کیا گم
دنیا کا سفر کٹھن ہے ، پیچیدہ بھی
ہو جاتا ہے بہر قدم رستہ گم

.....

ہر چند گزر گئے ، گزرنے والے
لوٹیں گے کہاں ڈوب کے مرنے والے
آؤ دریا سے ہی ذرا پوچھتے ہیں
کیا ہو گئے اس پار اترنے والے

خالد علیم

ابن عربی، اسلامی تھیالوجی کا مستند نام

اس تحریر کو لکھنے کا محرک حسن نثار کا، 16 جون کا کالم ہے- اُن کے قارئین اُن سے ابنِ عربی کے بارے کچھ جاننے کے خواہش مند تھے -''ارے'' خود سے کہا میں تو اُس عظیم ہستی کے مزار پر حاضری کی سعادت حاصل کئے بیٹھی ہوں- کیوں نہ اپنے ''بیاض'' کے قارئین کو تھوڑی سی سیر اور تھوڑی سی معلومات دوں-

شام میں پندرہ دن گزارنے کے بعد عراق جانے سے ایک دن پہلے جبل قاسیون Mount Qassyoun جانے کا پروگرام فائنل ہوا تھا- جبل قاسیون کو جب جب میں نے دمشق میں چلتے پھرتے دیکھا- مجھے تو پہاڑ پر کہیں ٹھہرے ہوئے اور کہیں متحرک کئی منظر نظر آتے تھے- اب اللہ جانے یہ سراب تھے یا حقیقی- بہر حال ایک منظر تو بڑا واضح ہو کر کئی بار آنکھوں کے سامنے آیا تھا- سفید عمارت، سادہ سی کھڑکیوں اور سبز چھت کے ساتھ نظر آتی تھی-

پہلی بار اس منظر کے نظر آنے پر میں نے قریب سے گزرنے والے ایک پڑھے لکھے اور سمجھداری کی کسوٹی پر پورا اُترنے والے شخص کو بلا تکلف روک لیا تھا- ادھیڑ عمری کے پیٹے میں مرد نے رک کر صاف ستھری انگریزی میں بتایا تھا کہ یہ محی الدین ابن عربی کا مزار مبارک ہے- ایک اور نے یہ بتایا تھا کہ اسی پہاڑ پر وہ مقام بھی ہے جہاں دنیا کا پہلا جرم ہوا تھا- قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا- جاتے جاتے اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہاں کچھ اور بھی یادگاریں ہیں- اگر گئیں تو وہ سب دیکھ لیں- ٹیکسی والے کے تین ہزار سیرین لیرا کے مطالبے پر میں چیخی-

لڑکے نے دونوں ہاتھ فضا میں دائیں بائیں لہرائے- پہلے ابن عربی اص صلاحیہ As Salhiyyah، پھر قاسیون اور پھر یادگار- اُس نے دونوں بازوؤں کا دائرہ سا بناتے ہوئے بہت سا سفر، پہاڑی

سلمیٰ اعوان

سفر کا مفہوم کچھ بے ربط سے جملوں اور کچھ تمثیلی انداز میں واضح کرنے کی کوشش کی- یقیناً وہ اس میں کامیاب ہوا کہ ہم بخوبی سمجھ گئے تھے کہ اتنی جگہیں- پیسے بہت مناسب اور کمی بالکل نہیں-

منت طرلوں سے 2500 سیرین لیرا پر فائنل ہوا- اس نے پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ پہلے وہ صلاحیہ کو اٹر جائے گا- صلاحیہ کو اٹر کے بعض حصے بہت خوبصورت، ماڈرن اور شاندار تھے -ہاں البتہ بعض قدرے ماٹھے تھے- یہاں صدیوں پہلے وہ لوگ آباد ہوئے جو صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کے ظلم وستم سے پناہ ڈھونڈتے یہاں آئے- پہاڑیوں کے دامنوں اور اس کی ڈھلانوں پر کہیں چھوٹے موٹے گھروں اور کہیں خیموں کی صورت پھیلتے اور آباد ہوتے چلے گئے- ان کا زیادہ پھیلاؤ دریائے Tora کے ساتھ ساتھ ہوا جو دراصل دریائے برادہ کی ہی ایک شاخ تھی-

آنے والے وقتوں کی دہائیوں میں وہ گرد جنگجو بھی جو صلاح الدین کے ساتھ آئے تھے- یہی کوئی بارہویں صدی میں وہ بھی یہیں سکونت پذیر ہو گئے -یوں اسے کچھ لوگ کردوں کا علاقہ بھی کہتے ہیں - المہاجرین بھی اسی کا نام ہے-

دھیرے دھیرے مسجدیں، مدرسے، اسپتال اور بہت سی شاندار عمارات بنتی چلی گئیں اور یوں یہ دمشق کا ہی ایک حصہ شمار ہونے لگا-

لڑکا اچھا ڈرائیور تھا- تنگ تنگ گلیوں میں سے بھی گاڑی کو لہراتا ہوا نکال کر لے جاتا- بعض جگہوں کے منظر نظروں پر بڑے گراں گزرتے تھے کہ بے ڈھبے سے مکان، تنگ گلیاں، ان میں بہتی نالیاں، دوڑتے بھاگتے پھرتے بچے - گلیوں میں ہی کریانے، پنساری کی دکانیں اُن میں خریداری کرتے نچلے متوسط طبقے کے لوگ- گاڑی رکی اور پتہ چلا کہ مزار تک پیدل جانا ہوگا- من وعن وہی درباروں والا منظر تھا- جب میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے راستے پر آگے بڑھتی تھی- اپنے وقت کا، اپنے بعد آنے والے وقتوں کا بہت بڑا عالم بھی میرے ساتھ ساتھ تھا- میں اُن کی کتاب زندگی کے ورق پلٹتی تھی-

شیخ محی الدین ابن عربی کی آبائی جگہ مرسیا Mursiya، سپین کا ایک علاقہ تھی- سن پیدائش یہی کوئی 1165ء اور وفات 1240ء کی ہے- والد مرسیہ کے دربار سے جڑے ہوئے تھے- ماموں اپنے وقت کے جید عالم تھے- سلطنت معاویہ کا

دربار عالموں، مفکروں، فلسفیوں اور صاحب کمال وفن کے لوگوں سے بھرا رہتا تھا- ابتدائی تعلیم تو مرسیہ میں ہوئی- ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بچپن ہی سے بہت نمایاں تھے- آٹھ سال کی عمر میں اشبیلیہ نقل مکانی ہوئی- وہاں کے علمی اور ادبی ماحول میں تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا- اس وقت اُندلس یورپی اثر کے تحت اندرونی مقامی سیاست میں بہت بری طرح اُلجھا ہوا تھا- اس کے باوجود اندلس علم و ادب اور فکری تحریکوں کا مرکز تھا-

جوان ہوئے تو شہروں اور ملکوں ملکوں پھرنا اور صاحب علم لوگوں سے ملنا شروع کر دیا- سینتیس 37 سال میں حج کیا - پھر نہ اُندلس گئے اور نہ مراکش- کچھ وقت میسو پوٹیمیا اور ایشیائے کوچک میں گزارا - رجعت پسند عالموں نے ان کی روشن خیالی کی بہت مذمت کی- قاہرہ میں بھی اُن کے نظریات وخیالات کے ساتھ ایسا ہی ہوا- نکالے جانے پر اصرار تھا- ساٹھ سال کی عمر میں وہ دمشق آئے اور پھر یہیں انہوں نے ڈیرے لگا لئے-

اپنے وقت کے ابنِ عربی جو اسلامی تھیالوجی (Theology) پر ایک اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتے تھے- یہ شخصیت اپنے عہد کے دانشور، فلاسفر، لکھاری، مذہبی رہنما، صوفی شخصیت اور سائنس دان تھے- اِس وقت کی پوری اسلامی دنیا میں وہ زیر بحث تھے- کچھ سائنس دانوں کو ان کے مابعد طبیعاتی Metaphysical نظریات سے اختلاف تھا- کچھ حامی تھے- کچھ کا خیال تھا کہ وہ اسلام کے عظیم ترین فلاسفر ہیں- کچھ کا خیال اُن کے دہریے ہونے پر تھا- کچھ اور کا کہنا تھا کہ اُن کی فکری سوچ اور تحریر کی تحریک دراصل خدائی تحفہ ہے- صوفی ازم اُن کے خیال میں ذہنی پریشانی کا واحد علاج ہے- فلاسفی شک کی طرف لے جاتی ہے - ابہام پیدا کرتی ہے- مگر خدا سے براہ راست رابطہ ہی روح کو سکون دیتا ہے-

انہوں نے اپنے اِس نظریئے پر بہت سی کتابیں لکھیں- دنیا کی مختلف زبانوں میں سینکڑوں کتابیں اور مضامین اُن کی زندگی، اُن کی کتابوں، اُن کے افکار و خیالات پر لکھے گئے- یہ کام زیادہ عربی، انگریزی، جرمن، سپینش، فرنچ اور فارسی میں ہوا- بہت سے ماہر شرقیات اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ابن عربی کی تحریروں نے بہت سے فلاسفروں ،دانشوروں اور صاحب علم لوگوں کو متاثر کیا جیسے ریمنڈ لولیو

Raymond Loleo اور دانتے۔
دانتے کی ڈیوائن کومیڈی کے بارے تو یہ تاثر بھی ہے کہ وہ اُن سے بہت متاثر ہے۔ جاپانی ماہر شرقیات Ezotsu کا کہنا ہے کہ Taoism فلاسفی، صوفی ازم اور تصوف کے میدانوں میں ابن عربی سے بہت متاثر ہے۔

میں نے کتاب بند کردی تھی کہ زندہ کھلی کتاب کے سامنے اُسے پڑھنے اور دیکھنے کے مقام پر تھی۔ ڈرائیور کو میں نے کہتے سُنا تھا کہ قاسیون کا پہاڑی سلسلہ بس یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ زائرین کی بہتات اور وہی مخصوص ماحول جو صوفیائے کرام کے درباروں اور مزاروں کا خاصہ ہوتا ہے اپنی پوری رنگینیوں سے یہاں کارفرما تھا۔ ملحقہ مسجد بہت خوبصورت، خاص طور پر مینار کی کندہ کاری نظروں کو کھینچتی تھی۔ مزار سطح زمین سے نیچے ہے۔ کئی پوڑے اُتر کر جانا پڑا تھا۔ جب زینہ اُترتی تھی تو سامنے دیوار میں پتھر پر کندہ شعر نے روک لیا تھا۔ میں نے کاپی کھول کر اس میں درج کیا۔

فلکل واحد یسموبہ
وانا الباقی العصر ذاک الواحد

اندر کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ شیشے میں مقید مزار مبارک اپنی رعنائیاں بکھیر رہا تھا۔ قیمتی قالین بچھے تھے۔ فانوسوں کی روشنی ماحول کو جگمگ جگمگ بناتی تھی۔ نم آنکھوں سے اٹھے ہوئے بے شمار ہاتھوں میں ہمارے ہاتھ اور آنکھوں میں اُتری نمی بھی اس ماحول میں شامل ہوگئی تھی۔

آپ کے پہلو میں آپ کے دو بیٹے سعیدالدین و عمادالدین کے مزار ہیں۔ عقبی سمت میں کچھ قبریں ہیں۔ ملحقہ دروازے دوسرے کمروں میں کھلتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب آبادی کا پھیلاؤ ہوا تو مزار کہیں ملبے کے نیچے آگیا۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ آپ کی پیشن گوئی تھی کہ جب سین شین میں داخل ہوگا تب محی الدین کی قبر ظاہر ہوگی۔ روایت ہے کہ جب عثمانی سلطان سلیم نے شام فتح کیا۔ یعنی سلیم کا سین شام کے شین میں داخل ہوا تو اس نے آپ کے مقبرے کے مقام پر کسی عمارت کے لیے کھدائی کروائی تو لوح مزار نکل آئی۔ ہم نے نفل پڑھے۔ فاتحہ خوانی کی۔ مدرسہ بھی دیکھا۔ پتہ نہیں کتنے لاکھوں ذہنوں کی سیرابی ہوئی۔ یہاں بھی نفل پڑھے اور باہر آگئے۔ مجاوروں نے مت ماردی تھی۔ نسرین کے پاس ٹوٹی ریزگاری تھی۔ وہی دے کر جان چھڑائی۔

☆☆☆☆☆

ولید بن مُغیرہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منصب نبوت پر فائز کیا تو پہلی وحی جو حضورؐ پر نازل ہوئی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی، جس میں فرمایا گیا کہ:

''پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا، جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

(۹۶:۱تا۵)

یہ نزول وحی کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے بعد ایک مدت تک رسولؐ اللہ پر وحی کا نزول بند رہا اور اس زمانہ میں آپ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ لیکن جب کبھی آپ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریلؑ نمودار ہو کر آپ سے کہتے کہ آپ اللہ کے نبیؐ ہیں۔ اس سے آپ کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت دور ہو جاتی تھی۔ پھر اس وقفہ کے بعد جب ازسرِ نو نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا آغاز سورۂ مُدّثّر کی پہلی سات آیات سے ہوا۔ ان آیات میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ:

''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ اور گندگی سے دُور رہو۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔'' (۷۴: ۱تا۷)

یہ ہدایات فرائضِ نبوت ادا کرنے کے لیے ضروری تھیں اور انھیں Pre-requisite کی حیثیت حاصل تھی۔

اس فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں جب رسولؐ اللہ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور قرآن مجید کی پے در پے نازل ہونے والی سورتوں کو آپ نے سنانا شروع کیا تو مکہ میں کھلبلی مچ گئی اور مخالفتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ چند مہینے اس حال پر گزرے تھے کہ حج کا زمانہ آ گیا اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے۔ اگر محمدؐ نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر

پیروز بخت قاضی

جا جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بے نظیر اور مؤثر کلام سنانا شروع کر دیا تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون ان سے متاثر ہو جائے۔ اس لیے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی، جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی ان کے اندر رسول اللہ کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمدؐ کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمدؐ کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا، نہیں خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں قرآن کو ان سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔

کچھ اور لوگ بولے انھیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ مجنون بھی نہیں ہیں۔ ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی بہکی بہکی باتیں اور الٹی سیدھی حرکات کرتا ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانگی کی بڑ ہے یا جنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؟

لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

لوگ بولے تو انھیں ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادوگروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمدؐ پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے۔ اس کی جڑ بہت گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔

اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمھاری قوم تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمدؐ کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے۔ یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اس کے باپ، بھائی، بیوی، بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انھوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کر دیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو

جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہ کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا۔

سورۂ مدثر کی آیات نمبر ۱۱ سے ۲۶ تک ولید بن مُغیرہ کا نام لیے بغیر بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو کیا کچھ نعمتیں دی تھیں اور ان کا جواب اس نے کیسی حق دشمنی کے ساتھ دیا ہے۔ اس کی ذہنی کشمکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ایک طرف دل میں وہ حضرت محمدؐ اور قرآن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا مگر دوسری طرف اپنی قوم میں اپنی ریاست اور وجاہت کو بھی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایمان لانے سے باز رہا بلکہ کافی دیر تک اپنے ضمیر سے جھگڑنے کے بعد آخر کار یہ بات بنا کر لایا کہ خلق خدا کو اس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کے لیے اسے جادوگر قرار دینا چاہیے۔ اس کی اس صریح بد باطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا کہ اپنے اس کرتوت کے بعد بھی یہ شخص چاہتا ہے کہ اُسے مزید انعامات سے نوازا جائے حالانکہ اب یہ انعام کا نہیں بلکہ دوزخ کا سزاوار ہو چکا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ:

”بہت سا مال اس کو دیا۔ اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے۔ اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی۔ پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں، وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، تو خدا کی مار اس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں، خدا کی مار اس پر، کیسی بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔“ (۷۴: ۱۱ تا ۲۶)

ولید بن مغیرہ کے دس بارہ بیٹے تھے جن میں سے حضرت خالدؓ بن ولید تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان بیٹوں کو کہیں اپنی روزی کے لیے دوڑ دھوپ اور سفر کرنے کی حاجت پیش نہیں آتی تھی۔ ان کے گھر کھانے کو اتنا موجود تھا کہ ہر وقت باپ کے پاس موجود اور اس کی مدد کے لیے حاضر رہتے تھے۔ اس کے سب بیٹے نامور اور با اثر تھے اور معاملات میں ان کی شہادت قبول کی جاتی تھی۔ اللہ کی اتنی نعمتوں کے بعد بھی ولید بن مغیرہ کی حرص ختم نہیں ہوئی اور یہ شخص دل میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا لیکن اپنی قوم میں محض اپنی وجاہت اور ریاست برقرار رکھنے کے لیے ایمان لانے پر تیار نہ تھا اور اس نے حضورؐ پر جادوگر ہونے کی تہمت لگانے کی تجویز سردارانِ قریش کو دی۔

☆☆☆☆☆

دنیا مکلی کا قبرستان ہے

غافر شہزاد کا یہ ناول (مکلی میں مرگ) پاکستانی ادب میں ایک شاندار اضافہ ہے جسے خانقاہی نظام، قبرستانوں کی اہمیت اور قبر فروشی کے بارے میں ایک دستاویز سمجھنا چاہیے - اگرچہ ٹھٹھہ (سندھ) میں مکلی کا قبرستان اپنی چار سو سالہ تاریخ رکھتا ہے اور اس کی مٹی میں ہندومت اور بدھ مت کے کئی پرچارک دفن ہیں لیکن اسلامی اعتبار سے اسے محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور صلاح الدین ایوبی کے زمانوں میں طبعی اور جنگی موت سے ہم کنار ہونے والوں سے وابستہ کیا گیا ہے- یہاں کلہوڑہ، ترکھان، سومرو، بلوچ، تالپور اور مغلیہ عہد کے بھی کئی قدیم حکمران دفن ہیں- اس قبرستان کی زیادہ عمارتیں، مقبرے اور چبوترے پختہ ہیں اور ان پر کئی زمانوں کے تزئین و آرائش کے ہنر آزمائے گئے ہیں- ہلکی گہری زرد بھوری یرقانی مٹی اور سیاہ ہوتی اینٹیں، گرے ہوئے مینارے، چونے اور گچ کی بنی قبریں زبانِ حال سے انسانی بے بسی کا نوحہ سناتی ہیں اور کہیں ترائی میں بہتے کمزور مہین سے دریا کے دوسرے

شاہین مفتی

کنارے پر ٹھٹھہ کا سمٹا سہما شہر آباد ہے۔
مصنف سوچتا ہے کہ اس فانی دنیا میں ہمیشہ کی زندگی پانے کے لئے معروضی اعتبار سے انسانوں نے زمان و مکان کا ہر نظریہ آزما ڈالا ہے۔ تہذیب و معاشرت، مذاہب، عمارات، عجائب خانے، کھنڈرات، سلسلہ وار قبریں، دریا کے کنارے آباد اور برباد ہوتے شہر۔۔۔ افسوس اہر شے وقت کے سمندر میں بہتی چلی جاتی ہے اور وقت ہر بار کسی نہ کسی دفن شدہ کہانی کو اچھال کر پار لگاتا اور پھر اسے امر کر دیتا ہے۔
مصنف نے اپنے ناول میں مکلی کے وسیع تر استعارے کو موت سے ہم کنار ہونے والی بہت سی معروف اور غیر معروف شبیہوں سے جوڑ دیا ہے اور سوال اٹھایا ہے کہ انسان کی اصلی زندگی کون سی ہے: وہ جو اس نے گزاری؛ وہ جو قبر میں ہے؛ وہ جو انگلی دنیا کے وعدے سے بندھی ہے یا وہ جو بیان کرنے والے لوگوں کے اذہان میں ابھاری جاتی اور پھر قبر کہیں پیچھے رہ جاتی ہے اور فرد کا ہیولیٰ وضاحت اور تشریح شدہ شخصیت کے ساتھ نسل در نسل لوگوں کے دلوں اور اذہان میں ایک مخصوص موجودگی میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ مصنف نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ تعمیرات کے ڈیزائن اور مزارات کی اشکال اپنے مکینوں کے شخصی اوصاف سے بندھی ہوئی ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ مغرب میں عمارت کا معیار استقامت، فعالیت اور جمالیات سے بندھا ہے لیکن برِ صغیر کی مذہبی عمارتیں جسم و روح کے مابین رشتہ قائم کرتی ہوئی زائر کے وجود کو آسمانوں کی بلندی کی طرف لے جاتی ہیں جبکہ زمین کی کشش بھی اسے اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔
مصنف کا خیال ہے انسانی مغالطے وقت گزرنے کے ساتھ ایک خود ساختہ سچائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پھر یہی خود ساختہ سچائی دائمی زندگی پا لیتی ہے۔ کہانی میں تہ در تہ کئی پلاٹ ہیں جنھیں مختلف کرداروں کے توسط سے آگے بڑھایا گیا ہے۔ امریکہ پلٹ ماہر تعمیرات ارسلان جو انگریزی کے ایک ایسے پروفیسر کا بیٹا ہے جسے مجسمہ سازی سے شغف تھا اور وہ ایک متشدد مذہبی جماعت کے خوف سے ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا۔۔۔ ارسلان کی ذہنی تربیت پاکستانی صوفی شاعری اور گلوکاری نے کی کہ اس کی ماں کا تعلق خواجہ غلام فرید کے کوٹ مٹھن سے تھا۔ چنانچہ وہ ایک مصفّیٰ روح اور قلب کے ساتھ پاکستان میں ایک نئے تعمیراتی

سسٹم کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہے اسی لئے عالمی تنظیم برائے روایتی عمارات و تعمیرات کانفرنس کی دعوت پر مکلی کھینچا چلا آیا ہے۔
طارق اسماعیل بھی ماہرِ فنِ تعمیر ہے لیکن صحافت اس کا پیشہ ہے اور اس کی صحافیانہ سرگرمیاں مزاروں سے جنم لینے والے کرداروں اور کہانیوں کے گرد گھومتی ہیں۔
وہ ہر بار اس نتیجے پہ پہنچتا ہے کہ نیکی اور بھلائی کے ہر کام کی تہ میں کرپشن اور مالیاتی اسکینڈلز کی کرم فرمائی جاری رہتی ہے۔
کہانی کا تیسرا بڑا کردار مستان خان ہے جو بنیادی طور پر اسٹیبلشمنٹ کا خفیہ رکن ہے؛ ہر بات ہر کام ہر سانحے پر نظر ہے، ظاہر بھی ہے اور مستور بھی؛ اپنے وردِ خفی اور متاثر کن شخصیت سے اس کے مریدین کی تعداد میں ہر لمحے اضافہ ہوتا رہتا ہے--- بابا مستان اپنی سطح پر ایک توازن کی علامت ہے۔ایک کردار صائمہ علی کا ہے جو اپنا مخصوص ایجنڈا رکھتی ہے اور بی بی پاک دامناں کے مزار کو شیعہ سنی تنازعہ بنانے کے باوجود مزار کی توسیع کے منصوبوں کو خلط ملط کرتی رہتی ہیں ۔انہی کرداروں میں ایک حافظ عبدالرحمٰن ہیں جو مزار کے ایک حصے میں مسجد کے خواہاں ہیں تاکہ اس کا مالیاتی تسلط قائم ہو سکے۔

کہانی کا ایک حصہ بی بی پاک دامناں، عثمان علی ہجویری، اچ شریف، پاک پتن، عبداللہ شاہ غازی کے مزارات کے گرد گھومتا اور یہ بتاتا ہے کہ ان مزاروں کے متولی اور ان قبروں سے منسلک شعبے کیسے مالیاتی کرپشن میں دھنسے ہوئے ہیں۔
دوسرا حصہ صوفیائے کرام جن میں سے اکثر و بیشتر شاعر ہیں، کے مقبروں کی تعمیر اور انتظام سے متعلق ہے جن میں سلطان باہو، بلھے شاہ اور دیگر شامل ہیں۔ ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ دریاؤں کا رخ مڑنے یا سیلاب کی تباہی کاریوں کے باعث میتوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا بھی رواج رہا ہے جس کی بنیادی وجہ بھی مالی وسائل کا تسلط ہے۔ شاہ جمال پوڈھولی اور ایک اور پیر پرست گھرانے کی باریک واردات کی جانب بھی ایک اشارہ موجود ہے۔ایک بحث قائد اعظم کے مزار سے بھی متعلق ہے جس کی تہ میں بھی مالیاتی فوائد اور ذاتی پسند ناپسند کی نفسیاتی گرہیں شامل ہیں۔
1981 میں سندھ کے قدیم اور وسیع قبرستان مکلی کو یونیسکو نے خالص فضا اور شفاف ماحول کے ضمن میں محفوظ آثار کی فہرست میں شائع کیا تھا۔ ارسلان اور طارق

اسی زیرو کاربن، زیرو انرجی والی کانفرنس میں شرکت کے لئے مکلی پہنچتے ہیں اور وہاں بانسوں کی مدد سے تعمیر ہونے والے کانفرنس ہال مع سامعین و منتظمین کے ان کا استقبال کرتا ہے۔ دانشور، مقرر، ثقافت و کلچر کی گفتگو میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ طارق زندہ لوگوں کے احتجاج میں مگن ہے جو مُردوں سے بھی بدتر زندگی گذار رہے ہیں لیکن ثقافتی ورثہ کے نام پر ان سے مال چھین کر قدیم مقابر کی تزئین پر ضائع کیا جا رہا ہے۔ روائتی تعمیرات و عمارات کی نفی کرتے ہوئے سادہ زندگی گذارنے پر تالیاں بجائی جارہی ہیں اور بانسوں کی اس بستی میں ارسلان The Bridge of Drina کے کردار ریڈی صاف کی المناک موت کے بارے سوچ رہا ہے، جسے بانسوں پر زندہ گاڑ دیا گیا تھا، صرف یہ کہنے پر کہ سیمنٹ اور لوہے کا پل بانسوں کے پل سے کہیں بہتر ہے ---- یہاں مصنف بخوبی جانتا ہے کہ غیر ملکی کانفرنس کی آڑ میں مقامی طالع آزما مکلی کے قبرستان کی وسیع و عریض اراضی پر قبضے کرنے کے بعد رہائشی کالونیاں بنانے کے منصوبے تیار کررہے ہیں۔

غافر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سب کردار مصنف کی مٹھی میں ہیں اور وہ انہیں ادھر ادھر ہونے کی اجازت نہیں دیتا چنانچہ پورا ناول انتہائی احتیاط سے لکھا گیا ہے۔ زبان و بیان ہر قسم کی جذباتیت سے پاک ہے۔ ناول کی تعمیر و تشکیل میں کوئی جھول نہیں۔ کہانی میں تجسس، فکر اور ہلکی سی افسردگی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ مصنف نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ مزار اور مسجد میں کیا فرق ہے جبکہ دونوں مقامات عبادت کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ شاید اصل خدا اُن معجزات سے عاری ہے جو صاحبانِ مزار کے دستِ قدرت میں پوشیدہ ہیں۔ تبھی تو ان مرے ہوئے لوگوں کے بیولے اپنے مریدین کے اعصاب پر سوار ہیں اور گاہے گاہے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔

غافر کی خوش قسمتی ہے کہ وہ خود بھی ایک آرکیٹیکٹ ہے اور محکمہ اوقاف کا بڑا افسر بھی -- مزار، صاحبِ مزار، متولی، مریدین، عمومی بے آسرا لوگوں کی مجبوریوں اور حاجی مستان کی نشہ بخش کارکردگی کو اس سے بہتر کون جان سکتا ہے -- سچ تو یہ ہے ساری دنیا غریبوں کے لئے مکلی کا قبرستان ہی ہے جہاں وہ خالص زندگی کی حسرت میں ہر روز مرتے اور دائمی زندگی کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

پیاری ثمینہ سید

مجھے اک نظم کہنی ہے
مگر یہ نظم کہنے سے ذرا پہلے
میں اپنے دل کا دامن تھام لوں گی

.....

اک سراپا نظم لڑکی--- جسے دیکھو تو ایسا لگتا ہے--- جیسے کوہ قاف کے پہاڑ سے اتر کر آئی پری ہے---

بڑی بڑی آنکھیں، لمبی سیاہ ریشمی زلفیں اور ہونٹوں پر سجی یاقوتی مسکراہٹ -----وہ مجھے ہمیشہ ایسی ہی لگتی ہے---ان پریوں جیسی-- جنھیں میں بچپن میں بہاروں کے رنگوں سے بھرے درختوں کے نیچے جا کر آوازیں دیا کرتی تھی۔

وہ اسی شہر میں رہتی ہے-- جس نے مجھے سانس لینا سکھایا--- مگر اس سے ملنے میں کچھ دیر ہوگئی----

پہلے میری ملاقات اس کے بھائی تنویر عباس نقوی سے ہوئی--- ہم نے کچھ مشاعرے ساتھ پڑھے---اور پھر وہ اسلام آباد کی ایک شاعرہ کو پیارا ہوگیا---اور پھر ان راستوں پر روانہ ہوا جہاں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا۔

اس کی بہن نوشین نقوی ریڈیو پاکستان لاہور کی راہداریوں میں زندگی سے بھرپور قہقہے بکھیرتی ملی--

اور پھر ثمینہ سید اپنی سیاہ زلفوں کو سنوارتے ہوئے--ایک ٹی وی کے مشاعرے سے پہلے میک اپ روم میں ملی--- عرفان صادق مشاعرے کے میزبان تھے---اور سب شاعر انھی کی دعوت پر اکٹھے ہوئے تھے--

ثمینہ سید کی مسکراہٹ، اس کی گفتگو اور اس کی کہانیوں سے شناسائی ہوتی گئی---

اس کی کہانیاں---اس کے اردگرد پھیلے گلی کوچوں میں بکھرے مسائل کی داستانیں تھیں---اور وہ کہہ رہی تھی--- کہانی سفر میں ہے---

مجھے اس کی کہانیوں میں اس لڑکی کی تلاش تھی جسے اس نے اپنی مسکراہٹ کے لبادے میں چھپا رکھا تھا--

نیلما ناہید درانی

چھوٹی عمر میں شادی۔۔۔ دو پیارے بچوں کی ماں بننے کے بعد۔۔۔ چھوٹی سی عمر میں بیوگی کا روگ۔۔۔

اس کی خوش قسمتی کہ اس کی والدہ اور اس کے بچے اس کا سہارا تھے۔۔ اس کی دل جوئی کے لیے۔۔۔ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے۔۔۔ اس نے تعلیم حاصل کی۔۔ سرکاری سکول میں نوکری کر لی۔۔۔

جب بچے بڑے ہو گئے تو لکھنے پڑھنے کی طرف دھیان دیا۔۔۔ کہانیاں، نظمیں اور غزلیں کہنے لگی۔

چار کتابوں کی مصنفہ بنی۔ اور پھر ایم اے کے بعد ایم فل بھی مکمل کر لیا۔۔۔

لیکن یہ ساری مصروفیات اس کے وجود میں پھیلنے والے دکھ کے ناسور کو کم نا کر سکیں۔۔۔

اس کی مسکراہٹیں اس کے درد کا درماں نہ تھیں۔۔۔ لیکن اس نے اپنے دکھوں، تکلیفوں محرومیوں کی طرح اپنی بیماری کو بھی سب سے پنہاں رکھا۔ دوست، احباب اور مختلف ادیبوں شاعروں کی کتابوں پر تبصرے شروع کیے تو اس میں بھی انفرادیت حاصل کی اور سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔۔۔

جبکہ اس کے اپنے دکھ۔۔۔ اس کی نظموں میں بکھرے تھے۔۔۔

مجھے اک نظم کہنی ہے
اک ایسی نظم جس سے
زندگی کو دائمی اثبات ملتا ہے
تمہیں تو سب پتا ہے نا
میری نظمیں، میری غزلیں
حیات بے اماں میں سانس لینے کا بہانہ ہیں۔

....

ثمینہ سید دور حاضر کی ایک مستند کہانی کار ہے۔۔۔ خوبصورت اشعار کہتی ہے اور لفظوں سے کھیلنا ہی گویا اس کی زندگی ہے:

آنکھ پہ خواب کا اجارا تھا
ورنہ یہ ذہن کب تمہارا تھا
وقت گزرا تو یہ ہوا احساس
زندگی نے مجھے گزارا تھا

....

چھوٹی بحر میں بڑے شعر کہنے کا فن بھی ثمینہ سید کو خوب آتا ہے:

آنکھیں پتھر ہو جاتی ہیں
سوچیں بنجر ہو جاتی ہیں

کوکھ میں سانپ پلا کرتے ہیں
یادیں نشتر ہو جاتی ہیں

تیری ساری تلخ سی باتیں
مجھ کو ازبر ہو جاتی ہیں

....

زندگی کبھی کسی کو ویسی نہیں ملتی۔۔ جیسی وہ چاہتا ہے۔۔ ہر انسان اپنی زندگی کو بدلنا چاہتا ہے۔۔۔ دوبارہ سے شروع کرنا چاہتا ہے۔۔۔ تاکہ وہ تلخیاں جو اس نے جھیلی ہیں۔۔۔ ان کے نشتر اس کے ذہن سے نکل جائیں۔۔ جو کانٹے، جو دکھ درد اس کو ملے ہیں۔۔۔ دوبارہ نا ملیں

ثمینہ سید نے اس احساس کو اپنی ایک نظم میں اس طرح سمویا ہے:

اپنی قسمت میں خود بناتی
تو ایسے نا بناتی جیسے کہ اب ہے
اس منظر میں نہ ہوتی
کسی اور جہان کی
جلتی بجھتی کہانی میں رہتی
کسی آئندہ کو جاننے کی شکتی رکھتی
اور گزرے زمانے کی ترتیب پلٹ سکتی
تو
کچھ لمحے بدلتی
کچھ تخفی کر دیتی
کچھ اپنے بدلتی
اور اپنا ہی سوچتی
بس اپنے لیے جیتی
کفِ افسوس نہ ملتی

....

ثمینہ سید کی ایک اور نظم
گمان کا ریشم --- کے چند مصرعے:

ناسور بنا ہے سارا بدن
سر کے بال سے پاؤں کے تلوے تلک
درد ہی درد
وہ جو سوچ کا اطلس تھا
وہ جو گمان کا ریشم تھا
اب الجھا ہوا ہے
تن پہ بھرم کی پھٹی پرانی چادر کو
سر تک کھینچوں تو پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں

....

ثمینہ سید کی ایک غزل کے چند اشعار:

کوئی دہلیز در بدلا نہیں جی
وہی ہے میرا گھر بدلا نہیں جی

بہت پاگل ہوا نے زور مارا
پرندوں نے شجر بدلا نہیں جی

وہی ہے آبلہ پائی ثمینہ
ابھی میرا سفر بدلا نہیں جی

....

لفظوں کی بساط پر کہانیاں، نظمیں، غزلیں اور تبصرے سجانے والی ثمینہ سید بیمار ہے--- اپنے درد، اپنے دکھ، اپنی محرومیوں اور بیماری کو مسکراہٹ میں چھپانے کا ہنر جاننے والی--- ثمینہ سید--- اب بھی پوری بہادری کے ساتھ اپنی بیماری کے سامنے سینہ سپر ہے--- اس نے ساری زندگی اک جہاد کی طرح گزاری ہے--- مجھے یقین ہے کہ وہ اس بیماری کو بھی اسی بہادری سے شکست دینے کی شکتی رکھتی ہے--

جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پیاری---

بہت سی کہانیاں، ہزاروں نظمیں اور سریلے اشعار تمہارے قلم کی نوک سے لپٹے تمہارے منتظر ہیں---

- مجھے تمہاری نظمیں زیادہ پسند ہیں--
- کیونکہ ان نظموں میں اصلی ثمینہ دکھائی دیتی ہے--- جس نے کہانی کے کرداروں--- یا غزل کے قافیہ ردیف کی بندش میں اپنے جذبات کو چھپانے کا ہنر نہیں سیکھا---

ہزاروں سال جیو--- اپنے بچوں اور ان کے بچوں کی ہزار ہا خوشیاں دیکھو--- آمین

☆☆☆☆☆

خالد فتح محمد کا ناول 'نیا گھر'

'نیا گھر' خالد فتح محمد کا تازہ ترین ناول ہے جو حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے خالد فتح محمد اپنے ناولوں میں نئے تجربات نہیں کرتے بل کہ ناول کی روایت میں پہلے سے موجود اسلوب اور فریم ورک میں ہی کہانی بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ کہانیاں زندگی سے براہ راست جڑی ہوتی ہیں مگر ایسے الگ اور منفرد زاویے سے بیان کی جاتی ہیں کہ جو عام دیکھنے والی آنکھ سے اوجھل ہوتا ہے۔ خالد فتح محمد کا یہی اسلوب انھیں اپنے ہم عصروں سے منفرد رکھتا ہے کہ جنھوں نے ناول کے اسلوب اور کرافٹ میں نئے نئے تجربات کر کے زندگی کو اس کی پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، خود بھی الجھے ہیں اور بعض اوقات قاری کو بھی الجھایا ہے۔

ناول کا بنیادی کردار عبدالمنان ہے مگر منان کا والد اس قدر اس کے حواس پر سوار ہے کہ سارے ناول کی کہانی میں وہ اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے، یوں منان سے زیادہ اس کے باپ کا کردار مرکزی بن جاتا ہے۔ منان کا باپ اپنی بیوی کے لیے اس کی خواہش کے مطابق غیر ملکی طرز تعمیر کا ایک بڑا گھر بنواتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منان کی ماں اپنے خاوند سے زیادہ پڑھی لکھی اور دنیا گھومے ہوئے ہوتی ہے جب کہ منان کا والد اپنے گھر اور شہر سے باہر کبھی نہیں گیا۔ منان کی ماں کو دوسرے ملکوں میں بنے گھر کی طرز پر اپنا گھر پسند آتا ہے مگر گھر کی تعمیر کے بعد جلد ہی وہ انتقال کر جاتی ہے اور منان کا والد، اس کے بیٹے کو اپنی محبوب بیوی کی آخری نشانی سمجھ کر، اس پر اور اپنے نئے گھر پر خوب توجہ دیتا ہے۔ منان کو اس کا والد دنیا بھر کے ملکوں کے قصے سناتا ہے کہ جو اس نے اپنی بیوی سے زندگی میں اتنی بار سنے ہوتے ہیں کہ وہ نہ صرف اسے ازبر ہو جاتے ہیں بل کہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان شہروں کی سیاحت پر خود بھی کئی بار جا چکا ہے۔

غافر شہزاد

کہانی کا بنیادی متن اس حوالے سے اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ جب یہ بتایا جاتا ہے کہ منان بھی اپنے والد کی طرح پراپرٹی ڈیلر کے کام سے رزق کماتا ہے جس کا بنیادی طریقہ کار یہ ہے کہ ایسی جائیدادیں جن کے کاغذات کسی حوالے سے نامکمل ہوتے ہیں یا ان کی ملکیت میں کچھ سقم رہ جاتا ہے، کے کاغذات بنوا کر، عدالت میں کیس کر کے اونے پونے داموں خرید کر انھیں بیچتا ہے اور پھر منافع کماتا ہے۔ منان اس رویے کو وہ اس وقت بھی اختیار کرتا ہے جب اسے اپنے آبائی نوکر کی بہو جمیلہ کہ جس کا میاں روزگار کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے، پسند آ جاتی ہے اور پھر اس کے تنسیخ نکاح کے جعلی کاغذات بنوا کر اس سے شادی کر لیتا ہے اور اس کے ملکیتی حقوق حاصل کر لیتا ہے۔

خالد فتح محمد نے یہاں ازل سے انسانی معاشرے میں چلی آنے والی تکون 'زن، زر، زمین' کے تانے بانے پر اس ناول کی کہانی بنی ہے۔ بدلتے معاشرتی رویوں کی عکاسی کی ہے اور انسان کی ہمیشہ سے چلی آنے والی فطرت کو بیان کیا ہے کہ وہ دوسروں کی ملکیتوں پر قابض ہوتا چلا آیا ہے خواہ وہ عام آدمی ہو یا بادشاہ، اپنی اپنی سطح پر بنیادی انسانی رویہ ایک ہی رہتا ہے۔

ناول میں جمیلہ کہ جو منان کی بیوی بنتی ہے، کا کردار بہت ہی زوردار اور توانا ہے۔ وہ اپنے پہلے خاوند کے ساتھ ازدواجی اور خاندانی سطح پر مطابقت پیدا نہیں کر پاتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے پہلے خاوند سے زیادہ چالاک، پڑھی لکھی اور اونچے خواب دیکھتی ہے۔ اسے یہ غلط فہمی بھی رہتی ہے کہ اس کی شادی تو منان کے ساتھ ہونا تھی مگر کسی طرح سے غلط فہمی کے سبب اسے منان کے آبائی نوکر کے بیٹے کے ساتھ ازدواجی رشتے میں باندھ دیا گیا ہے۔ ایسی صورت حال میں خاوند کی عدم موجودگی میں منان کی جانب متوجہ ہونا جمیلہ کا عمومی رویہ تھا۔

ناول کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے کہ جب انتقال کے بعد بھی منان کو اپنا باپ گھر میں ویسے ہی اپنی نشست پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے اور وہ آپس میں ویسے ہی باتیں کرتے ہیں۔ اسے طلسماتی حقیقت نگاری کی ذیل میں قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس کی توجیہہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مرنے کے بعد روحیں چاہیں تو وہ اپنی مرضی سے زندہ لوگوں کو دکھائی دے سکتی ہیں، ان سے باتیں کر سکتی ہیں۔ منان کے باپ کو اپنے مرنے کے بعد بیٹے کی تنہائی کا بہت قلق ہے اور وہ بار بار اسے شادی کی ترغیب دیتا ہے۔ منان جب جمیلہ کی جانب راغب ہو جاتا ہے اور اس سے تعلق قائم کر لیتا ہے، پھر اس کا باپ اسے دوبارہ کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ جمیلہ پوری طرح منان کے گھر اور کاروبار میں شرکت کرتی ہے اور اپنے بھرپور کردار کے ساتھ ناول میں اپنا اظہار کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

اُردو لغت نویسی کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

زبان کی ترقی لغت اور قواعد کے حوالے سے مسلسل کام کا تقاضا کرتی ہے۔ جیسے جیسے زبانوں میں ذخیرہ علمی بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے زبان کی لغت کو بھی نئے حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور بنانے کا کام جاری رہتا ہے۔ اس حوالے سے مسلسل تراش خراش زبان کو ترقی کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر آنے والا وقت انسانی معاشرے میں جہاں نئی نئی تبدیلیاں لے کر آتا ہے وہیں نئے نئے الفاظ بھی زبان کا حصہ بنتے ہیں۔ ان نئے آنے والے الفاظ کو لسانی حوالے سے جانچتے ہوئے لغات میں زیر بحث لا کر ان کے معانی کا تعین کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھی جاتی ہے۔

جس رفتار سے زبان ترقی کرتی جاتی ہے اسی رفتار سے زبان کی لغت بھی تیار ہونی چاہیے۔ زبان کے حوالے سے لغت نگاری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی زبان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس میں لغت نگاری کے کام کو مکمل نہ کر لیا جائے۔

ڈاکٹر عابدہ بتول نے اردو لغت کے حوالے سے کام کر کے اس کی اہمیت کے تقاضوں کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب 'اردو لغت کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' لغت نگاری کی تاریخ اور کام کے حوالے سے کئی قسم کی معلومات پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر عابدہ بتول کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ایک ایسا تحقیقی وتنقیدی کام ہے جس میں کئی زاویوں سے اردو لغت اور لغت نویسی کا احاطہ کیا گیا ہے اور اردو لغت کے حوالے سے کیے گئے کام کی روشنی میں لغت نگاری کو پرکھا گیا ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب میں لغت نویسی کے لسانیاتی پس منظر کے ساتھ زبان، لغت اور فرہنگ پر تفصیلی بات کی گئی ہے۔ لغت نگاری کے اصول اور روایت کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ یہاں لغت اور فرہنگ کے فرق کو بھی انھوں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس باب میں مصنفہ نے لغت کی تعریف کے بارے میں تفصیلی قلم اٹھایا ہے۔

محمد اشرف کمال

ایک اہم کام لغت کے تعریف اور لغت نگاری کی تحدید کا ہے کہ اسے کس طرح زبان کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عابدہ بتول نے اس حوالے سے مختلف کتابوں، رسالوں، لغات اور انسائیکلوپیڈیا میں درج تعریفوں کی مدد سے لغت کے معانی بیان کیے ہیں۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے لغت کی تعریف کے حوالے سے فرہنگ عامرہ، انگلش ٹو انگلش اینڈ اردو ڈکشنری فیروز سنز، رینڈم ہاؤس ویبسٹر کالج ڈکشنری، اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، قومی انگریزی اردو لغت، آکسفورڈ اردو انگلش ڈکشنری وغیرہ کی مدد سے مختلف تعریفوں کو بیان کیا ہے۔

اردو لغت نگاری کی ابتدا اسی لیے کی گئی کہ زبان کو سیکھنے اور سمجھنے میں لغت کا کردار کلیدی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے کئی نام سامنے آتے ہیں۔ وہ لغت نگاری کی ابتدا کے بارے میں لکھتی ہیں:

''قواعد اور تاریخ زبان کے علاوہ اس زمانے میں اردو لغت نویسی پر چند حضرات نے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں جن میں سید محمد دہلوی نے 1851 میں دہلی سے ''مفتاح اللغات''، سورج مل نے 1974 میں پٹنہ سے ''ہندوستانی لغات'' سید عبدالفتاح نے ''اشرف اللغات'' اور ناسخ کی نفس اللغہ'' مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی کی ''بہار ہند'' ضامن علی جلال لکھنوی کی ''منتخب اللغات'' امیر احمد مینائی کی ''امیر اللغات'' اور مولوی سید احمد دہلوی کی ''فرہنگ آصفیہ'' شامل ہے۔'' (ص40)''

امیر مینائی کا نام جہاں اردو شاعری کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے وہاں انھیں اردو کے ابتدائی لغت نگاروں میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان کی کتاب ''امیر اللغات'' کو اس حوالے سے ایک اہم لغت تصور کیا جاتا ہے۔

مصنفہ نے لغت نگاری کی روایت کے حوالے سے عربوں کو قدیم لغت نگاری میں اولیت کا درجہ دیا۔ عربوں میں اصمعی، ابوعبیدہ اور باقاعدہ لغت نگار خلیل بن احمد (م 17) نے ''کتاب العین'' لکھی جو کہ عربی لغت کی اساس ہے۔

خلیل بن احمد نے پہلے حلقومی حروف، پھر دندانی حروف، اور پھر لبوں سے نکلنے والے حروف لکھے۔ یہ لغت ع سے شروع ہوتی ہے۔

انھوں نے عربی میں لغت نویسی پہ بھی قلم اٹھایا ہے۔ کیونکہ اردو زبان میں بے شمار الفاظ عربی کے ہیں اس لیے اردو لغات کی ترتیب و تزئین میں عربی لغات سے بھی مدد لی جاتی رہی ہے۔

لغت نگاری میں حضرت ابن عباسؓ نے بھی اہم کام کیا ہے۔ ابوعلی القالی نے 339ھ میں پانچ ہزار حروف پر مشتمل کتاب لکھی۔ جو کہ ہمزہ سے شروع ہوتی ہے۔

چینیوں میں عربوں سے پہلے لغت نگاری شروع ہوئی۔ قدیم ترین چینی لغت یولیس پولکس (Yulius Pollux) نے ترتیب دیا۔

اس کے بعد فارسی میں لغت نویسی کی روایت کے بعد مصنفہ نے اردو لغت نویسی کے حوالے سے فضل الدین محمد بن قوام کا ذکر کیا ہے۔ جس نے چودھویں صدی عیسویں میں فارسی لغت لکھی مگر اس کا ایک

باب ہندی الفاظ پر بھی مشتمل ہے۔ ضیا الدین خسرو کی خالق باری، اور انشاء کی دریائے لطافت اور اردو کی باقاعدہ پہلی لغت عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' کا ذکر کیا ہے

دوسرا باب لغت کے ابتدائی آثار کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

تیسرا باب مستشرقین کی مرتبہ لغات کے حوالے سے مباحث پر مشتمل ہے۔ اس باب میں سترھویں، اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے حوالے سے لغت نگاری کے ساتھ ساتھ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مستشرقین کے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھے باب میں اردو لغت کے ارتقا کا 1947 تک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اردو کے پہلے لغت نگار سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب 1947 کے بعد لغت نویسی کی تاریخ سے متعلق ہے اس حوالے سے نہ صرف بیسویں صدی بلکہ اکیسویں صدی میں کیے جانے والے کام کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

چونکہ موجودہ دور کو انٹرنیٹ کا دور کہا جاتا ہے۔ اس لیے علوم وفنون کو انٹرنیٹ سے منسلک کرنا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ ہر وہ علم یا فن جس کی انسانی زندگی کے ارتقا اور ترقی میں اہمیت ہے اسے بڑی تیزی کے ساتھ انٹرنیٹ کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔

جدید ذرائع مواصلات اور الیکٹرانک میڈیا کی ترقی نے جہاں بہت سی زبانوں کے وجود کی بقا پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے وہاں کئی زبانیں الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے ایک نئے ذخیرۂ الفاظ سے بھی مالا مال ہوئی ہیں۔

انگریزی کی زیادہ تر لغات پہلے ہی سے انٹرنیٹ پر منتقل ہو چکی ہیں، آکسفورڈ ڈکشنری اور دیگر بے شمار جدید اور قدیم ڈکشنریاں۔ موجودہ دور میں بڑی تیزی سے ساتھ اردو لغات کو انٹرنیٹ کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے وزارت برائے انفارمیشن ٹیکنالوجی نے اکیسویں صدی کے آغاز میں اس حوالے سے ترقی کی راہیں کشادہ کیں۔ اس ضمن میں انٹرنیٹ پر اُردو کے حوالے سے لغات، مشینی ترجمے اور بولنے کے حوالے سے تکنیکی اور مختلف پروگرام قابلِ ذکر ہیں۔

چھٹا باب انٹرنیٹ پہ اردو لغت کا احاطہ کرتا ہے۔ جس میں لسانی، تیکنیکی، مواجہی ساخت کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اس باب میں مصنفہ نے لغت کے حوالے سے مختلف پراجیکٹ کا ذکر کیا ہے۔ اس حوالے سے آن لائن لغت کے حوالے سے کیا جانے والا کام بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس باب میں تکنیکی انداز میں لغت کے حوالے سے ہونے والی لسانی پیش رفت کو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ صفت کی تفصیل، اسم، صف، محاورات، فعل، مرکبات، ضمیر کے حوالے سے مختلف فارم دیے گئے ہیں اور بعد میں ان کے مشمولات کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اس طرح یہ باب لغات کے حوالے سے بنیادی اور تکنیکی اہمیت رکھتا ہے۔

کتاب کے آخر ماخذات کا اندراج کیا گیا ہے۔ تاکہ محققین ان کتابوں سے مزید استفادہ کر سکیں جن سے مصنفہ نے استفادہ کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

''محبت سے مزاحمت تک'' فرحت عباس شاہ فن اور شخصیت

یہ جو فرحت ہے نا میں نے تو سنا ہے کوئی
چاند سا نکلا ہے اردو کے دبستانوں میں

.....

فرحت عباس شاہ ایک ملٹی ڈائمنشنل شخصیت کے مالک ہیں قدرت نے انہیں صلاحیتیں اور تخلیقی جواہر عطا کرتے ہوئے بڑی فیاضی سے کام لیا اور ان کو بے پناہ ٹیلنٹ سے نواز کر اس دنیا میں بھیجا۔ انہوں نے اپنی انتھک محنت، جدوجہد اور خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے نام کا لوہا منوایا اور جس شعبہء زندگی میں بھی کام کیا اپنے آپ کو منوایا ان پر ہر سطح پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم رہا ان کے ہر کام کو بین الاقوامی سطح پر کھلے دل سے تسلیم کیا گیا اور بے پناہ سراہا گیا اور یہ بات کوئی معمولی بات نہیں بلکہ غیر معمولی ہے۔ بحیثیت شاعر، نجا ماسٹر، اینکر، گلوکار، موسیقار، صحافی، پرینک سٹار، اداکار، براڈ کاسٹر، نقاد، پبلشر، پبلک سپیکر، سوشل ورکر، ماسٹر ٹرینر اور ماہر اقتصادیات ہر شعبہ میں ان کے نام اور کام کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے لیکن ان سب میں سے شاعری ایک ایسا فیلڈ تھا جس کو انہوں نے اپنے آپ سے پل بھر بھی جدا نہیں کیا اور باقی تمام شعبوں پر اس کو فوقیت دی یہی وجہ ہے کہ وہ ایک لاجواب، باکمال اور اپنے طرز و اسلوب کے منفرد شاعر کہلائے۔ اپنے، بیگانے، دوست، دشمن سب ان کی شاعرانہ عظمتوں کے معترف نظر آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ عوام الناس کے مقبول ترین شاعر کہلائے۔ ان کی شاعری جذبات، احساسات اور کیفیات سے بھرپور نظر آتی ہے۔ یہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں ترین مقام رکھتے ہیں اور سینئر شعرائے کرام نے بھی ان کی فنی اور تخلیقی صلاحیتیں کھلے دل سے تسلیم کیں اور ہر سطح پر ان کا اعتراف کیا۔

فیصل زمان چشتی

شاعری کے خانِ اعظم جناب منیر نیازی نے کہا تھا کہ شاعری ہر دور میں اپنا وارث تلاش کرتی ہے اور عہدِ موجود میں شاعری نے فرحت عباس شاہ کی صورت میں اپنا وارث تلاش کر لیا ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت خراجِ تحسین اور کیا ہو سکتا ہے۔ قدرت نے ان کے حصے میں جو عزت، شہرت اور وقار رکھا وہ ادبی دنیا میں بہت کم کم شعرائے کرام کو نصیب ہوا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ فرحت عباس شاہ نے قدرت سے صرف اور صرف شاعری ہی مانگی اور قدرت نے بھی ان کو یہ جوہر عطا کرتے ہوئے کسی بخل سے کام نہیں لیا بلکہ ان کو شاعرانہ عظمتوں کا امین بنا دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے ہماری دو نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ فرحت عباس شاہ پہ قدرت کی یہ خصوصی عنایت رہی ہے کہ وہ تخلیقی وفور کی دولت سے مالا مال ہے۔ اور یہ وہ تخلیقی وفور ہے جس کے دم سے ان کے ہاں جذبات اور احساسات کی نازک پرتوں کا اظہار نہایت سہولت، پختگی، رچاؤ اور انتہا درجے کی بے ساختگی سے ہوتا ہے۔ ویسے تو قدرت نے فرحت عباس شاہ کو "شام کے بعد" جیسی لازوال اور بے مثال غزل کہنے کے بعد امر کر دیا تھا اور رہتی دنیا تک ان کا نام ایک ستارے کی طرح آسمانِ ادب پر چمکتا رہے گا مگر ان کی کتاب "مزاحمت کریں گے ہم" تقریباً سترہ سال کے طویل وقفے کے بعد ہمارے سامنے آئی ہے اس سے پہلے ان کی غزلوں اور نظموں کے انچاس مجموعے منصۂ شہود پر آ کر عوام الناس اور نقادوں سے مقبولیت اور فن و کمال کی سند پا چکے ہیں جس کی وجہ سے یہ پہلے ہی ایک جید اور سکہ بند شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام اور شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی نظم و نثر میں کل کتابوں کی تعداد اس کتاب سے پہلے ستر ہے۔ آٹھ اور کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ جہاں جہاں اردو پڑھی بولی یا سمجھی جاتی ہے وہاں وہاں فرحت عباس شاہ کا نام جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اردو ادب پر ان کی غزل کی ایسی چھاپ لگ چکی ہے کہ لوگ انہیں غزل کا شاعر مانتے ہیں اور سچی بات بھی یہی ہے کہ انہوں نے غزل میں سینکڑوں اعلیٰ شعار تخلیق کیے ہیں۔ کئی خوبصورت اور قبول عام تجربات بھی کیے اور غزل کو اس مقام پر لا کر کھڑا کیا ہے کہ وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن اگر فرحت عباس شاہ سے پوچھا جائے تو وہ اپنے آپ کو نظم کا شاعر کہلوانے میں زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ یہ بات کہنے میں حق بجانب بھی نظر آتے ہیں کیونکہ ان کی نظموں کے کم و بیش بیس مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں یہ ایسی ایسی نظم کہہ چکے ہیں کہ قاری پڑھتے ہوئے ورطۂ حیرت میں آ جاتا ہے کہ اتنی خوبصورت، اچھوتی اور جمالیات سے بھرپور نظمیں ہماری نظروں سے ابھی تک اوجھل کیوں رہیں۔ کوئی

شاعر ایک یا دو طویل نظمیں لکھ لے تو اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے جبکہ فرحت عباس شاہ کی درجن بھر طویل نظمیں ہمارے سامنے موجود ہیں جن میں رابعہ، موت زدہ، سرابی، روگ، اکیسویں صدی کی پہلی نظم، خیال سور ہے ہو تم، ملوہم سے، مرگ بر شیطان اعظم، ہیر آکھیا جوگیا وے اور ہیر فرحت شاہ وغیرہ شامل ہیں یہ وہ نظمیں ہیں جو اردو شاعری کا وقار ہیں اور اس کی عظمتوں میں اضافے کا باعث ہیں۔ ان میں تخیل پرواز، شعریت، معنویت، بنت، جدت الفاظ اور نشست و برخاست اپنے بام عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اہم اور دلچسپ بات یہ کہ ان نظموں کو شائع ہوئے تقریباً بیس سے پچیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن اردو ادب کے عہدِ موجود کے نقاد بوجوہ ان کا تذکرہ کرنے اور ان پر تبصرہ کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر انیس ناگی، جیلانی کامران، احمد ندیم قاسمی اور علی اکبر منصور جیسے جید ناقدین انہیں اردو نظم کا بڑا شاعر قرار دے چکے ہیں۔ حیرت اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا شعری ارتقائی سفر انتہائی کامیابی اور پوری آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ایک اچھا شاعر ہمیشہ نظریاتی بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ ان کے تازہ ترین شعری مجموعے "مزاحمت کریں گے ہم" میں ان کا انداز عہدِ موجود کی تلخیوں اور سچائیوں کا بے باک، بے لاگ اور غیر جانبدارانہ اظہار ہے۔ انہوں نے شاعری کو نیا خون اور نئی دھڑکنیں عطا کی ہیں اور یہ کتاب ان کا مزید نئی منزلوں کی جانب سفر کا نقطہ آغاز بھی ہے۔ کیونکہ فرحت عباس شاہ فلسفہ تلاش و جستجو کا قائل ہے اور اس کے نزدیک تلاش ہی منزل ہے:

ملا نہ کچھ ترے حسنِ سلوک سے بڑھ کر
بتاؤ فلسفہ کوئی تو بھوک سے بڑھ کر

مجھے پتہ ہے میں شاعر ہوں اور سچا ہوں
میں خود ملوک ہوں ہر اک ملول سے بڑھ کر

"مزاحمت کریں گے ہم" میں فرحت عباس شاہ اپنے مزاحمتی رنگ میں پہلے سے زیادہ مربوط انداز میں جلوہ گر ہوئے ہیں یہ مجموعہ جرات و بے باکی، حریت و حمیت، حوصلہ مندی، ہمت، عزم و استقلال، ثابت قدمی، مقصدیت، جامعیت اور حقانیت کا مرقع بھی ہے اور ان کٹھن راستوں پر چلنے والوں کے لیے وہ روشن مینار ہے جس کی روشنی نئی سمتوں کا تعین کر رہی ہے۔ عوام اور معاشرے کے ساتھ جڑت نے اس کتاب کو لازوال، بے مثال، مقبولِ عام اور امر کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نے دلوں کو تسخیر کیا ہے اور اس بات پر ایمان مزید پختہ ہو جاتا ہے کہ قدرت

جب کسی شخص کو کسی خاص مقصد کے لیے منتخب کر لیتی ہے تو اس پر عنایات کی بارش کر دیتی ہے۔ فرحت عباس شاہ کو بھی قدرت نے شاعری کے لیے منتخب کر لیا تھا اور شاعری کی گرہیں ان کے لیے کھول دیں، اس کے اسرار و رموز ان پر منکشف کر دیے۔ ایک اور بات جو شاعری کے حوالے سے کہی جاتی ہے کہ وہی شاعری عالمگیر اور آفاقی ہوتی ہے جس کی جڑیں معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے معاشی، معاشرتی اور سماجی مسائل کی نشاندہی کرتی ہوں۔ آج کے مشکل ترین دور میں جب لوگوں پر زمین تنگ کی جا رہی ہے اور لوگوں کا جینا مشکل بنایا جا رہا ہے ایسی کتاب کا تخلیق کیا جانا ایک نعمت سے ہرگز کم نہیں ہے۔ عوام کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے اشعار دیکھیے:

پھاڑوں نہ گریبان، دامادم نہ کروں میں
احساس کو اظہار سے باہم نہ کروں میں

میں روز اٹھاتا ہو کسی خواب کی میت
اور آپ یہ کہتے ہیں کی ماتم نہ کروں میں

صد حیف جو مظلوم کی آواز نہ بن پاؤں
صد حیف اگر شعر کو پرچم نہ کروں میں

.....

''مزاحمت کریں گے ہم'' ایک ایسے وقت میں شائع ہوئی ہے جبکہ بالعموم پوری دنیا اور بالخصوص ہمارا معاشرہ بہت سارے چیلنجز اور خطرات سے نبرد آزما ہے اور اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے ایسے موقع پر یہ کتاب معاشرے کے ناسوروں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا قلع قمع کرنے کی تجاویز بھی پیش کرتی ہے:

کسی دھرنے نہ کسی دھونس نہ میخانوں سے
انقلاب آتے ہیں مظلوم کی شریانوں سے

لے گیا چھین کے تو آج جمع پونجی بھی
ٹیکس کے نام پہ ہم سوختہ سامانوں سے

.....

کچھ عرصہ سے ادبی منظر نامے پر مسلسل ایسی شاعری سامنے آ رہی تھی جو صرف مصرعہ سازی اور قافیہ پیمائی کہلوانے کے ہی قابل ہے یا اس میں صرف مشاعرہ لوٹنے کی غرض و غایت ہی مد نظر رکھی جا رہی تھی اس میں معنویت اور مقصدیت غائب تھی ایسی شاعری آج کے دور ابتلا میں وقت کے ضیاع کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ شاعری ہر دور میں انقلابات برپا کرنے کا موثر اور کارگر ذریعہ رہی ہے۔ ہمارے پیارے ملک پاکستان کو بھی ڈاکٹر اقبال کے وژن اور شاعری کے طلسماتی اثر نے اپنے حصار میں رکھا ہے۔ فیض احمد فیض اور حبیب جالب کی شاعری بھی عوام الناس کا شعور بیدار کرنے کا ذریعہ بنی رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ

حالات اور ترجیحات تبدیل ہوتی رہتی ہے اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی ایسا بڑا قد آور اور مضبوط شاعر اٹھے جو اس کمی اور خلا کو اپنے مضبوط و مستحکم نظریات، ماضی اور حال کی تاریخ پر گرفت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ صلاحیتوں اور جرأتِ اظہار سے پورا کرے۔ ہماری خوش بختی ہے کہ قدرت نے اس کے لیے مقبول ترین اور نابغۂ روزگار شخصیت جناب فرحت عباس شاہ کا انتخاب کیا جس کے نتیجے میں یہ کتاب ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ یہ کتاب بین الاقوامی مسائل اور دنیا کو اپنے شکنجے میں کسنے والے فرعونوں کا پردہ بھی چاک کر رہی ہے اور نئی شاعری، نئے خیالات، نئے مضامین، نئی تراکیب اور واقعتاً جدید اور آفاقی شاعری بھی عطا کر رہی ہے۔ فرحت عباس شاہ کی پوری زندگی مسلسل جدوجہد، مشقت اور انتھک محنت سے عبارت ہے۔ زندگی میں دکھ درد اور مصائب ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے انہوں نے ہمیشہ جوانمردی، خندہ پیشانی اور حوصلہ مندی کے ساتھ تمام آلام و مصائب کا سامنا اور مقابلہ کیا۔ ان کا شعری سفر ان کے فکر و خیال، علم و فراست اور فہم و ادراک کی بلندیوں کا پتہ دیتا ہے۔ ان کے دو اشعار دیکھیے:

وہی ہے جبر وہی بے بسی ہماری ہے
وہی خدا ہیں، وہی بندگی ہماری ہے

تمہارے ظلم کا انجام ہونے والا ہے
ہمیں یقین ہے اگلی صدی ہماری ہے

.....

ان کے مزاج میں قدرت نے شروع سے ہی مزاحمت رکھ دی تھی اور انہوں نے ساری زندگی ہر اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی اور مزاحمت کی جس میں ان کو انسان کی بے بسی یا جبر نظر آیا۔ انہوں نے عملی طور ہر اس فرعون کے خلاف علم بغاوت کیا جس نے بھی انسانوں کو غلام یا جنس سمجھ کر معاملہ کیا۔ فرحت عباس شاہ کی بغاوت اور مزاحمت علی الاعلان ہوتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے کہا کہ:

مٹاو گے دباؤ گے جہاں جہاں مزاحمت
دکھائی دے گی اب تمہیں وہاں وہاں مزاحمت

یہ تیری سوچ تھی کہ بچ کے جائے گا نکل کہیں
وہیں پہ تیری موت ہے جہاں جہاں مزاحمت

.....

فرحت عباس شاہ دوٹوک موقف کا مالک ہے ان کا کوئی دوست ہے تو پکا دوست ہے اور اگر کوئی دشمن ہے تو اس کو علی الاعلان للکارتے ہیں۔ یہ بات ان کو نقصان بھی پہنچا جاتی ہے لیکن ان کو اس کی کبھی پروا نہیں رہی ہے لیکن کچھ لوگ ان کی سچائی اور کھرا پن ہضم نہیں کر پاتے اور ان کے خلاف باقاعدہ مہم چلاتے ہیں کردار کشی کی کوششیں کرتے ہیں، پروپیگنڈہ کرتے ہیں ان کے کام اور شخصیت کو نقصان پہنچانے کے لیے مسلسل مصروفِ عمل

رہتے ہیں۔ لیکن جس طرح عشق اور مشک چھپانے سے نہیں چھپتا اسی طرح ان کی شخصیت اور شاعری لاکھ دبانے اور چھپانے سے دنیا کی نظروں سے نہ اب تک اوجھل کی جاسکی ہے نہ آئندہ کی جاسکے گی بلکہ ان کی شاعری کی خوشبو اور مہک ایک جہان کو معطر کیے ہوئے ہے اور قدرت نے ان کا نام اور کام اتنا ہی بلند کیا جتنا اس کو دبانے کی کوششیں کی گئیں۔ اسی لیے انہوں نے کہا کہ:

یزیدیوں اور دجالیوں سے بڑی پرانی عداوتیں ہیں
ہمارے بچوں کو بھی پتہ ہے کہ یہ لڑائی نئی نہیں ہے

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مزاحمت ان کے مزاج کا لازمی جزو ہے کیونکہ یہ خود بھی ظلم برداشت نہیں کرتے اور ظلم ہوتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتے انہوں نے اپنی پوری زندگی نظریاتی آزادی کا علم تھامے رکھا۔ کسی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر محسوس کرنا ہمدردی کے زمرے میں آتا ہے اس کے دکھ اور کرب کو اپنا سمجھتے ہوئے اس کی نشاندہی کرنا اور اس کا حل تلاش کرنا انسان دوستی اور غمخواری کہلاتا ہے۔ فرحت عباس شاہ نے پوری انسانیت کی بقا کو درپیش چیلنجز کو محسوس کیا اور اس کے خلاف مزاحمت کا حوصلہ بھی دیا۔ میں یہ بات بڑے یقین اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ ''مزاحمت کریں گے ہم'' ایک لازوال اور بے مثال کتاب ہے اور ظلم کے خلاف مزاحمت کا آئین ہے۔ انہوں نے ایک جگہ رہنمائی کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

یہی ہے رسم یہی ہے نظام دنیا میں
اُدھر ہیں خاص ادھر ہیں عوام دنیا میں

ہوں بادشاہتیں ، جمہوریت یا وردیت
سبھی کا ایک ہی ہوتا ہے کام دنیا میں

اس کتاب میں سب رنگ موجود ہیں ہر مصرعے اور شعر میں ان کا فطری اور منفرد اسلوب اپنی تمام تر رعنائیوں، شعلہ بیانیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ پوری تابناکی اور بیباکی سے آسمانِ سخن پر ضوفشاں دکھائی دیتا ہے۔ دو مزید اشعار دیکھیے:

گاہے گاہے کسی غمخوار کی یاد آوے ہے
خون آلود کو تلوار کی یاد آوے ہے

کھینچ مت اتنا بھی ابرو کو تہہ گیسوئے کج
ہم کو یارانِ طرح دار کی یاد آوے ہے

ایک اور جگہ پر ان کا انداز دیکھیے:

پیش از دل بھی، پسِ لب بھی نظر آتا ہے
خود کو جب دیکھتا ہوں رب بھی نظر آتا ہے

بعد آنکھوں کے مرا دل بھی نکالا اس نے
اس کو شک تھا کہ مجھے اب بھی نظر آتا ہے

ان کے تخلیقی وفور اور آمد کا ایک زمانہ معترف ہے اور اس کتاب میں ان کا یہ کمال پوری

شدت، توانائی اور رچاؤ کے ساتھ نظر آتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ نئے اور جداگانہ راستوں کا انتخاب کیا ہے یہ ہمیشہ ہواؤں کے مخالف پرواز کرنے کے عادی رہے ہیں۔ یہ بہاو کے مخالف سمت تیرتے ہوئے زیادہ لطف محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح کی کیفیت کے اشعار دیکھیے:

سب راستے دشمن ہوئے اشجار مخالف
تو میرا ہوا ہے تو ہوئے یار مخالف

میں تو کسی قابل ہی نہیں تم کو سمجھتا
تم میرے بنے پھرتے ہو بیکار مخالف

ہم لوگ غریبوں سے الجھتے نہیں فرحت
ہم لوگ بنا لیتے ہیں سردار مخالف

.....

فرحت عباس شاہ نے پوری فکری توانائی سے یہ بات بتائی ہے کہ یہ وقت محبوب کے لب و رخسار کی خوبصورتی، ہجر و وصال کے لمحات اور کیفیات کو بیان کرنے اور بتانے کا نہیں ہے۔ پوری دنیا سخت ترین مشکل حالات اور مراحل سے گذر رہی ہے یہ وقت لوگوں کی فکری راہنمائی کرنے کا ہے لوگوں کا شعور و فہم بیدار کرنے کی اشد ضرورت ہے اور فرحت عباس شاہ اس گھمبیر اور مشکل ترین صورتحال میں لوگوں کی آواز بھی بنے ہیں اور رہنمائی بھی کی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ان کی زندگی بھر کی جدوجہد اور شاعری عوام کے لئے وقف ہے۔ وہ عوام کی حالتِ زار بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تم جو مر جاؤ تو خالق کی رضا نے مارا
میں وہی ہوں کہ جسے ٹھیک قضا نے مارا

ہائے تعلیم فروشی نے مرے بچوں کو
میرے ماں باپ کو بھی مہنگی دوا نے مارا

.....

انہوں نے دنیا بھر کی استعماری قوتوں اور طاقتور طبقے کو للکارا ہے جو پوری دنیا کی آبادی کو بغیر کسی رنگ و نسل کی تمیز کے پیسہ تو کیا خون کے آخری قطرے کو بھی نچوڑنے کے درپے ہیں۔ ان قوتوں کا مقصد طاقت اور ہر قسم کی دولت کا حصول ہے چاہے وہ تیل کی صورت میں ہو چاہے سونے اور معدنیات کی صورت میں ہو چاہے افرادی قوت کی شکل میں ہو اور چاہے اجناس کی شکل میں ہو۔ فرحت عباس شاہ نے ان طاقتوں کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے کہا ہے کہ:

سعودیہ سے یا لندن سے تل ابیب تلک
عذاب بھیج دیا کس نے ہر غریب تلک

تو اس کے جال میں کب تک پھنسا رہے گا بتا
کچل کے رکھ دیا جس نے ترا نصیب تلک

اسی ضمن میں ایک اور شعر دیکھیے۔

قبضے کی وسائل پہ یا پھر بیر کی خبریں
مغرب سے کہاں آئیں کبھی خیر کی خبریں

یہ ارتکاز دولت کے خلاف ہیں اور بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا، مکان، صحت، تعلیم ریاست میں بسنے والے ہر شخص کا بنیادی حق قرار دیتے ہیں۔ اب ان کے اشعار لوگوں کے دلوں کی آواز بنتے جا رہے ہیں:

اتنی بھی نہ مستی کر
ظالما روٹی سستی کر

مرے ہوؤں کو اور نہ مار
قبرستان کو بستی کر

ایک اور شعر:

ڈنڈا دے یا سوٹی دے
سات کروڑ کو روٹی دے

.....

معاشرے کے غریب اور نادار لوگوں کے نمائندہ دو اور اشعار دیکھیے۔

نگری نگری بستی بستی
روٹی مہنگی عزت سستی

تیرے گھر سونے کے چمچے
میرے گھر زیور بھی جستی

.....

ایک اور سوال جو نہایت ضروری ہے کہ دنیا کی اقتصادیات اور معاشیات پر ان کی اتنی گہری اور عمیق نظر کیسے ہے وہ کس طرح اکنامکس کی روز بدلتی ہوئی صورتحال سے باخبر رہتے ہوئے اس کی گھمن گھیریوں کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں اور دیئے گئے الٹے سیدھے اعداد و شمار سے درست معاشی تخمینے لگا لیتے ہیں اور اس پر اپنی رائے بھی رکھتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر رکھی ہے اور دنیا سے غربت کو دور کرنے کے لئے دنیا کو Twist up Economic Theory جیسا شاہکار نظریہ دے چکے ہیں جس پر Oxford سے University London ریسرچ کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے جنرل منیجرز اور ڈائریکٹرز اس کی منظوری بھی دے چکے تھے لیکن دنیا میں رائج سودی نظام کے باعث اس تھیوری کو نافذ العمل نہ کیا جا سکا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس کو سود سے منسلک نہیں کر سکتا۔ یہ Interest free نظام ہے جو میں لے کر آنا چاہتا ہوں۔ مصر کے سابق صدر مرسی نے اس سسٹم کو پڑھا اور اپنے ملک میں رائج کرنے کے لیے ان کو مصر بلوایا ان سے بریفنگز لی اور اس کے لیے ایک ٹیم بھی تشکیل دے دی تھی لیکن بدقسمتی سے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ یہاں پر بھی انہوں نے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے بڑے اداروں کی پرکشش آفرز اور لگژری مراعات کو اپنے نظریات سے ٹکراؤ کے باعث رد کر دیا۔ اس بارے میں ان کی کتاب World Economic Crisis

Analysis and resolve

اشاعت کے آخری مراحل میں ہے جو جلد ہمارے سامنے ہوگی۔ فرحت عباس شاہ دنیا میں ہونے والی اقتصادی تبدیلیوں اور اتار چڑھاو کی بنیادی وجوہات سے اچھی طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ دنیا کی معاشیات اور اقتصادیات کہاں کہاں سے کنٹرول کی جارہی ہیں اور ان قوتوں کے کیا مقاصد ہیں اسی لیے آپ کو اس کتاب میں جابجا اقتصادیات سے جڑے اشعار ملتے ہیں۔ جیسا کہ:

کبھی سڑکیں تو کبھی تیل مسلط کر کے
کھینچ لیتا ہے لہو تیل مسلط کر کے

پہلے تو دکھ مرے اجناس میں تبدیل کیے
پھر تہی دست کیا سیل مسلط کر کے

.....

ایک اور جگہ ایک شعر دیکھیے۔

ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جب او کے ہے
ان سب کو تو لگتا ہے رب او کے ہے

.....

اسی ضمن دو اور اشعار دیکھیے:

کرتا رہتا ہے قتلِ عام نظام
پھر بھی کتنا ہے شاد کام نظام

تیل ، سونا ، ڈرگز ، ڈالر اور
بینک ، بارود بے لگام نظام

.....

فرحت عباس شاہ لوگوں سے ایک دوسرے سے بڑھتی ہوئی دوری سے متفکر دکھائی دیتے ہیں اگر رشتے قائم رہیں محبتیں بانٹیں جائیں تو احساس پیدا ہوتا ہے احساس ہو تو دکھ درد بانٹے جاتے ہیں۔ ان کو خدشہ ہے کہ اگر ہماری یہ بےمثال روایات ختم ہوگئیں تو صدیوں سے جاری ہمارا یہ سفر اپنے انجام کو پہنچ جائے گا:

ایسے لاحق ہوا یہ شہر کا ویرانہ مجھے
روز اک خوف لپٹ جاتا ہے انجانا مجھے

روز اک درد مجھے راہ میں آ ملتا ہے
اور کہتا ہے سلام، آپ نے پہچانا مجھے

حالانکہ عشق سے بڑھ کر کوئی دانائی نہیں
اور کچھ لوگ کہے جاتے ہیں دیوانہ مجھے

.....

اس کتاب میں فرحت عباس شاہ نے غزل کو نئے ذائقے دیے ہیں۔ اور اس کو نئی منزلوں کی جانب روانہ کیا ہے ان کے مضامین انتہائی منفرد اور عام روایت سے بالکل ہٹ کر ہیں۔ غزل کو جدید بنانے کے چکر میں پچھلی پانچ چھ دہائیوں سے جو تجربات کیے جاتے رہے ہیں اور دانستہ طور پر غزل کا چہرہ مسخ کرنے کی لگاتار کوششیں کی گئی ہیں وہ قابل تشویش ہیں۔ لیکن فرحت عباس شاہ نے غزل میں نئے تجربات اتنی خوبصورتی اور فکری پختگی و مہارت سے کیے ہیں جس سے غزل میں

شعریت، خوبصورتی، بانکپن اور جمالیات میں کمی نہیں آئی بلکہ اس کی معنویت اور مقصدیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے غیر محسوس طریقے سے غزل کی ہیئت میں تبدیلیاں کی ہیں جس کی وجہ سے غزل کے موضوعات روایتی موضوعات سے آگے بڑھ کر لوگوں کے روزمرہ معاملات ان کے معاشی اور سماجی مسائل تک پھیل گئے ہیں اور غزل کی جڑت معاشرے سے مزید مضبوط ہوگئی ہے اور انہوں نے غزل کو عام لوگوں کے قریب کردیا ہے۔ انہوں نے غزل کی اہمیت، افادیت اور وقار کو مزید بڑھایا ہے یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ انہوں نے نئے شعرا کے لئے غزل میں نئے امکانات پیدا کردیئے ہیں اس کا کینوس وسیع کردیا ہے اور غزل کے دامن میں مزید وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اگر آپ ''مزاحمت کریں گے ہم'' پڑھیں گے تو آپ میری باتوں سے یقیناً اتفاق کریں گے۔

آخر میں ایک اور اہم بات جو میں کہنا نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیشہ سے بڑی اور عظیم شخصیات کی مخالفت کی جاتی رہی ہے۔ ان کے راستے روکے جاتے رہے ہیں۔ ان کے لیے مشکلات پیدا کی جاتی رہی ہیں۔ ان کا معاشی استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے ہم عصرین ان سے ہمیشہ خائف بھی رہتے ہیں۔ جس طرح غالب آج بھی نئے نئے زاویوں اور جہتوں سے آشکار ہورہا ہے اسی طرح فرحت عباس شاہ جو حال کا اور آنے والے زمانوں کا شاعر ہے جو آئندگان پر بھی ان کے ظرف کے مطابق کھلتا رہے گا اور چشمِ فلک کو حیران کرتا رہے گا۔ اللہ پاک ان پر اپنا خاص فضل و کرم فرمائے ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ عمر خضر عطا فرمائے تاکہ یہ ہماری اور آنے والی نسلوں کی راہنمائی کرتے رہیں اور ہمیں اپنی گرانقدر تخلیقات سے نوازتے رہیں جو ادب کا وقار ہیں اور اس کی آن بان اور شان بھی ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار کے ساتھ اختتام کرتا ہوں:

یہ بات طے ہے، اسے شعر کا پتہ ہی نہیں
کہ جس نے فرحتِ عباس کو پڑھا ہی نہیں

میں ایسے دور میں تخلیق کر رہا ہوں غزل
جہاں سوائے بلنگڑ کے کچھ رہا ہی نہیں

وریدیں دکھتی ہیں دل سر میں آدھڑکتا ہے
عذابِ شعر کبھی آپ نے سہا ہی نہیں

چھچھورے لوگ اچانک مشاعروں کی فضا
تباہ کرگئے ایسے کہ کچھ بچا ہی نہیں

میں جھک رہا ہوں جہاں پر وہاں علی تو ہے
تو جھک رہا ہے جہاں پر وہاں خدا ہی نہیں

یہ شاعری مرے در کی غلام ہے فرحت
جو میں نے کہنا ہے وہ تو ابھی کہا ہی نہیں

☆☆☆☆☆

ہمدمِ دیرینہ

میرے لیے یہ مقام انتہائی باعثِ افتخار و انبساط ہے کہ آج میں اپنے عزیز دوست، جو بلاشُبہ اب عزیزِ جہاں بن چکا ہے، کے اعزاز میں برپا اِس مجلس میں حاضر ہوں۔ میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں کہ میری دِلی کیفیات کیا ہیں اور میں اِس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں؟ انسان کی دِلی کیفیّات ..... انسان کے محسوسات پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر دِل اداس ہو تو ہر چیز بے رنگ، ہر دُھن بے سُر اور ہر حُسن بے کشش لگتا ہے۔ زندگی کی اوّلیں ضرورت یعنی اُمنگ دم توڑ دیتی ہے، مگر جب دِل مسکرا رہا ہو تو ساری کائنات ساتھ مُسکاتی ہے۔ پھولوں میں رنگ و بہار اور اَدھ کھلی کلیوں میں بھی حُسن نظر آتا ہے۔ بہتے جھرنے گاتے محسوس ہوتے ہیں اور ہر آواز ..... اِک نغمۂ جاوداں۔ ٹھٹھرتا موسم فقط جذبات کی حدّت سے دِلکش انداز پا لیتا ہے۔ زندگی کی اُمنگ لپک لپک کر اُبھرتی ہے۔ چناں چہ آج بھی وصلِ دوست کے حسین لمحوں میں ہر طرف بہار ہی بہار نظر آ رہی ہے۔ اگرچہ باہر شدید سردی ہے لیکن موسم، ماحول اور گرد و پیش سب کچھ خوبصورت نظر آ رہا ہے:

نیّر قریشی

غالب نے کہا تھا:

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے، اسد

....

اور پھر اسی شعر کے مصرع ثانی میں اس "شمعِ سخن" کے "حُسنِ فروغ" تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، خود ہی بتاتا ہے کہ:

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

....

اگر ایک شاعر بننے کے لیے غالب کا وضع کردہ اصول درست ہے تو میرے لیے شبہے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی اگر میں یہ کہوں کہ نثار ایک پیدائشی شاعر ہے۔ کیوں کہ یہ اُس وقت بھی پہلو میں دلِ گداختہ رکھتا تھا جب باولی عُمر سے خانوں کے گرد پھرتی رہتی ہے اور انسان شعور کی منزلوں سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک "شاعر" کے لیے صرف دلِ گداختہ ہی کی ضرورت نہیں ہے بل کہ دو اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہیں "فطری شعور" اور "استعدادِ علمی"۔ فطری شعور سے میرا مطلب یہ ہے کہ جنم ہی سے شعر کہنے کی صلاحیت و اہلیت ہو، نہ کہ شاعر بننے کے لیے دھینگا مشتی سے کام لیا جائے۔ دوسری خصوصیت سے مُراد یہ ہے کہ جاہل نہ ہو بل کہ حصولِ شاعری کے لیے علومِ مروجہ پر عبور حاصل ہو۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں شمہ برابر بھی شک نہیں ہے کہ نثار پیدائشی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے حالات، شاعری کی مختلف جہات، رجحانات، داخلی و خارجی محرکات اور عصری تقاضوں ہی سے واقف نہیں بل کہ کرم کتابی بھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اِسے کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق ہے اور اِسی شوق کی دارفتگی ہے کہ آج اس نے محض اپنی کتابیں رکھنے کے لیے الگ سے ایک کمرا کرایے پر لے رکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو کتابوں کی تعداد ہے جو بلاشبہ ہزاروں میں ہے۔ اگر کتاب کی دوستی اور مطالعے کا ذوق وشوق نہ ہو تو سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے والے انسان کے لیے بڑی موت ہے۔ ذہنی اور قلبی موت اور یہ موت حقیقی موت سے بھی زیادہ کرب انگیز اور اذیّت ناک ہوتی ہے۔ نجانے وہ لوگ کیسے جیتے ہیں؟ جن کو کُتب بینی کا ذوق نہیں اور جو ادب کے معاملے میں بے ادب ہیں۔

میں کوئی نقاد نہیں، تاہم صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اپنی شاعری کے محاسن و عیوب گنوانے ہیں۔ یہ کام اہلِ علم کا ہے۔ مجھے اس کی تصانیف کے متعلق بھی کچھ نہیں کہنا کہ وہ بھی میزانِ نقد و نظر ہی میں کوئی وزن پائیں گی۔ تاہم صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اپنی شاعری اور تصانیف میں جذبہ و احساس کے جو لازوال پھول اس نے کھلائے ہیں، وہ مدّتوں یاد رہیں گے۔ آج مجھے آپ کے ڈاکٹر پروفیسر نثار ترابی نہیں بل کہ اپنے نثار کے بارے میں ذاتی حوالے سے بات کرنی ہے۔ یہ اُس وقت کی بات جب وہ نثار احمد نثار تھا اور اپنے نام کے حوالے سے پریشان تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ نام بدل لو کہ آگے بھی نثار اور پیچھے بھی نثار کچھ موزوں نہیں لگتا۔ اس لیے کہ ایک ہی آدمی بار بار نثار ہو، یہ ذرا مشکل کام ہے۔ یہ عقدہ اس نے سمجھ لیا اور اپنا نام نثار ترابی رکھ لیا۔ اثر لکھنوی نے لکھا تھا:

کاش! اثر دیتا کوئی عہدِ گزشتہ کا نشاں
زندگی ڈھونڈ رہا ہوں، وہ کہاں ہے، کہ جو تھی؟

میں جب اُس زندگی میں نکلا تو لڑکپن کی روٹھی ہوئی عمر دماغ کی کھڑکیوں سے جھانک رہی تھی اور اشاروں ہی اشاروں میں کچھ کہہ رہی تھی، جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ میں اب کبھی واپس نہیں آؤں گی۔ میری اور نثار کی دوستی ستائیس برسوں پر محیط ہے اور تسکین و اطمینان کا پہلو یہ ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس میں کوئی نشیب نہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ہماری دوستی کا یہ سفر ہمیشہ فراز ہی کی طرف جاری رہا۔

تلازمۂ خیال نے آج 2006 مجھے 1980-81 کا وہ دور جاں فزا یاد کروا دیا جب مَیں اور نثار راولپنڈی گورنمنٹ کالج، اصغر مال میں اکٹھے تھے۔ شعر و نغمہ کی لطافتیں ہمارے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور ہم خوابوں، رنگوں، خوشبوؤں، تتلیوں اور جگنوؤں کی شاعری اور محبت کے اُس سرمدی جذبے کی شاعری، جس کی کونپل ہر دل میں پھوٹتی ہے کی وجد آفرینیوں میں گُم رہ کر جینے کی خُو کر رہے تھے۔ یہی ہماری دوستی کا نقطۂ آغاز تھا۔ نثار کے جنونِ فشتہ ساماں کی شورشوں کو دیکھتے ہوئے ہی ہمارے اُستادِ محترم اُردو اور پنجابی

کے معروف شاعر جناب پروفیسر ماجد صدیقی نے اسے دیوانہ قرار دیا تھا۔ میں اُس وقت سمجھ نہ سکا کہ یہ اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف تھا یا اس کے روشن مستقبل کی پیش بینی مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ فرزانگی اپنے مفہوم کے اعتبار سے دیوانگی کا متضاد ہی سہی لیکن فرزانگی کا مقام دیوانگی کے رفیع و عظیم مقام سے کہیں پست ہے۔ کالج میگزین ''کوہسار'' کے 1980 کے شمارے میں ہم دونوں کے مضامین شائع ہوئے اور پھر یہ سفر جاری رہا۔ ہم اپنے محبانِ خاص کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ اور شعر و ادب پر گفتگو رہتی۔ وقت یُوں ہی گزرتا رہا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ہماری ملاقاتوں میں سالوں کے وقفے بھی آتے رہے، نثار اور میں تعلیم کے اختتام پر ایک دوسرے سے عارضی طور پر بچھڑ گئے۔ اب زندگی کا کٹھن مرحلہ یعنی حصولِ روزگار درپیش تھا۔ 1986 کے اواخر میں مَیں مقابلے کا امتحان دینے امتحان گاہ پہنچا تو نثار بھی وہاں موجود تھا۔ میں اُس امتحان میں کامیاب ٹھہرا اور نثار ناکام لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ میں کامیاب ہو کر بھی افسردہ ملُول تھا اور یہ ناکام رہ کر بھی مطمئن و مسرور۔ یوں میں محکمۂ کسٹم میں افسر بھرتی ہو کر تربیت کے لیے اکیڈمی چلا گیا۔ ایک سال کی تربیت کے بعد میں لوٹا اور مرحومہ پروین شاکر کی معیت اور نگرانی میں اپنی نوکری کے سفر کا آغاز کیا۔ اس دوران میں نثار کی تلاش میں رہا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ نثار محکمۂ مال میں سینئر کلرک بھرتی ہو گیا ہے۔ میں خود تو پریشان تھا ہی، اس پر اس کی پریشانی مُستزاد تھی۔ یہ دونوں میدان ہمارے ذوق اور طبعی رجحان کے خلاف تھے۔ میں جانتا تھا کہ ہم دونوں زیادہ دیر اس راہ پر نہیں چل سکیں گے۔ نثار کی خویش داری تو مسلّم ہے مگر میں جب اسے محکمۂ مال کے بعض تقاضوں میں جکڑا ہوا پاتا تو بے اختیار کہہ اُٹھتا کہ میرا دوست ملازمت کی ''اطاعت شعاریوں'' کا کب خُوگر ہو گا؟ معاش و معیشت کی جکڑ بندیاں اس کے مطابق حال نہ ہوئیں تو اس کے ادبی ذوق کا کیا بنے گا؟ لیکن مجھے زیادہ عرصہ انتظار کی زحمت نہ اُٹھانا پڑی۔ گرمیوں کی ایک خاموش اور سنسان سہ پہر دروازے پر

مانوس سی دستک ہوئی - دروازہ کھولا تو سامنے نثار شاداں و فرحاں، ایک اطمینان بخش مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ بغل گیر ہو کر ملا اور بولا ''میں نے بوجھ اُتار دیا ہے''۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو کہنے لگا ''استعفیٰ دے کر آرہا ہوں۔'' میں مزید پریشان ہو گیا۔ میری پریشانی بھانپتے ہوئے پھر بولا ''فکر نہ کرو، عزت سے آیا ہوں''۔ یہ سن کر میرے حافظے نے احسان دانش کا یہ شعر اُگل دیا:

صد شکر کہ افلاس کی یلغار میں دانش
فاقہ کوئی توہینِ ہنر تک نہیں پہنچا

.....

یُوں یہ جلد ہی محکمہ مال سے محکمہ حُسن و جمال (ادب و ثقافت) کی طرف آ گیا تاہم مجھے کوچۂ ملامت چھوڑنے میں پندرہ سال لگ گئے۔ اس عرصے میں یہ شعبۂ تدریس اور ریڈیو پاکستان پر بحیثیت کمپیئر بھی اپنی صلاحیتیں آزمانے لگ گیا۔ ہماری ملاقاتیں جاری رہیں۔ ہم دونوں نے اچھے بُرے اور دُکھ سُکھ کے دن مل کر اکٹھے گزارے ہیں۔ ملاقاتوں میں طویل وقفوں کے باوجود ہماری دوستی اور باہمی خلوص میں ذرا برابر فرق نہیں آیا۔ وہ جو مشہور لبنانی دانشور خلیل جبران نے کہا ہے تو غلط نہیں کہا کہ ''تم جس کے ساتھ مل کر رہتے ہو، اُسے بھول سکتے ہو لیکن جس کے ساتھ مل کر روئے ہو، اُسے نہیں بھول سکتے۔'' نثار نے جتنی محنت کی ہے اس مقام تک پہنچنے میں، اُس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ کتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا اسے لیکن یہ ہاتھ توڑ کر بیٹھ نہیں رہا بل کہ تیشۂ محنت سے کامیابی کی نہر مسلسل کھودتا رہا اور بالآخر اپنے مقصود کو پانے میں کامیاب ہو گیا۔

مجھے ایک اور اعزاز بھی حاصل ہے کہ جب نثار اپنے ذہنِ رسا میں ''گلابوں کی بارات'' ترتیب دے رہا تھا تو میں اُس بارات کا پہلا باراتی تھا۔ 93-1992 کی بات ہے کہ ہم دونوں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ یہ اچانک بولا ''میں ماہیے اُردو میں لکھ رہا ہوں۔'' یہ میرے لیے نئی بات تھی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ ماہیا پنجابی صنف ہے۔ اسے نثار اردو کے قالب میں کیوں کر اور کیسے ڈھالے گا؟ لیکن آپ نے

دیکھا کہ اس کے دستِ ہنر نے اپنے فردوسِ تخیل میں کس طرح اور کس خوبی سے یہ منظر تخلیق کیا۔ ایک دن یہ میرے پاس آیا اور اپنے ابتدائی مایے سنائے:

کس چاؤ میں نکلے تھے
ملبوس تھا شیشے کا
پتھراؤ میں نکلے تھے

برسات ہی کتنی ہے
اِس دور میں اشکوں کی
اوقات ہی کتنی ہے

دل رویا ہے میرا بھی
پنڈی تیری گلیوں میں
کچھ کھویا ہے میرا بھی

.....

گزشتہ چار پانچ برسوں سے ہمارا رابطہ پھر منقطع تھا۔ میں ڈی ایم ڈیجیٹل مانچسٹر والوں کا ممنونِ احسان ہوں کہ انھوں نے اپنے ادبی پروگرام میں اُنھیں ادبی مکالمے کے لیے مدعو کیا۔ اُن کی وساطت سے میرا بچھڑا ہوا دوست مجھے پھر سے مل گیا ہے۔ اور یوں میں کتنا خوش ہوں؟ اِس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ذوق (مرحوم) نے ویسے ہی تو نہیں کہا تھا:

اے ذوق! کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

.....

آخر میں مَیں اِس محفل کے منتظمین کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جنھوں نے یہ خوبصورت محفل برپا کی ہے۔ رواں سال کی یہ آخری مجلس ہوگی۔ یہ گویا نئے سال کے لیے ''بیعانیہ سُرور'' کا کام دے گی۔ بیعانیہِ سرور اس لیے کہ نئے سال کی تمام تر سرخوشی و سرمستی کا یہ ابتدائیہ ہوگی۔ جس میں آنے والی ''ادبی مجالس'' کی ''کتابِ شعر و سخن'' مرتّب ہوگی۔ یہ لوگ بلاشبہ مُستقبل کی ادبی مجالس کے فنکار ہیں۔ ملکۂ بریڈفورڈ کے رُوے بہار آفریں پر اپنی قلم کاریوں اور گل افشانیوں کی افشاں چھڑکیں گے اور اِسے حسیں سے حسیں تر بنائیں گے۔

(معروف شاعر و نقاد ڈاکٹر نثار ترابی کے اعزاز میں مورخہ 27 دسمبر 2006 بروز بدھ بریڈفورڈ برطانیہ میں منعقدہ تقریب پزیرائی کے موقع پر پڑھا گیا)

☆☆☆☆☆

لیوٹولسٹوئی کے ناول ''اینا کیرینینا'' کا تجزیاتی مطالعہ

نبیل احمد نبیل

ABSTRACT

KareninaAnnaofanalysisCriticalA

A Critical analysis of Anna Karenina

Leo Tolstoy earns great honour as a writer of world's classics. His novels depict nineteenth century Russia in a graphic manner with all human passions and emotions. Anna Karenina is known as one of the best novels ever written in fiction. Through this novel, Tolstoy reflects spiritual decline of the central character Anna, who commits suicide after leading a life of base and illicit relations with her lover and betraying her husband. On the other hand, the writer portrays another character, Levin, at the place of spiritual height. Through these characters, human nature of good and evil is revealed with minute details. The novel covers a period of Russian life between 1872 and 1876 with life like spectacles of Moscow and Petersburg in the days of Tzar before the Russian Revolution. This novel was also picturized in Hollywood and the film enjoys reputation of a classic movie at box office. The Theme, the plot construction, characterization and manner of narrating the story remain superb in the hands of Tolstoy

لیو نیکولا ئیوچ ٹولسٹوئی (1828-1910 Leo Tolstoy) عالمی کلاسیکی ادب کا عظیم نام ہے۔ ٹالسٹائی نے روسی فکشن میں متعدد شاہکار یادگار چھوڑے جن میں War and Peace, Albert, Anna Karenina, Boyhood, Father Sergius, Master and Man, Resurrection, The Cossacks, The Forged Coupon, The Kreutzer Sonata, Youth, A Confession, The Death of Ivan Ilych شامل ہیں۔ ٹولسٹوئی کے فکشن میں Stories Short کی بھی ایک طویل فہرست ہے مگر ٹولسٹوئی کے دو ناول اس کے شاہکار (Master Piece) ہیں' ایک "War and Peace" اور دوسرا "Anna Karenina" اینا کیرینینا (Anna Karenina) 1872-77 کے درمیان کے منظرنامے کو Depict کرتا ہے۔ اس ناول کا انگریزی زبان میں ترجمہ 1901 میں Constance Black Garnett نے کیا۔ اس ناول کا اردو میں ترجمہ 1966ء میں انعام الحق نے کیا جو دارالاشاعت ماسکو سے شائع ہوا۔ آنا کارینینا جو انیسویں صدی سے لے کر آج تک ناول کے قارئین کا خاص طور سے اور ادب میں دلچسپی لینے والوں کا عام طور سے محبوب ترین ناول ہے۔ اس کی مقبولیت کا ایک حوالہ یہ بھی ہے کہ اس پر ہالی وڈ نے ایک فلم بھی بنائی جو Box Office پر بے حد مقبول ہوئی۔

اس ناول کا محرک ٹولسٹوئی کی بیوی کی ڈائری میں لکھا ہوا وہ واقعہ ہے جو "یاسنگی ریلوے اسٹیشن پر پیش آیا جہاں آنا سٹپانو ونا نامی ایک عورت نے اپنے محبوب کی بے وفائی کے ردعمل میں ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی۔" (1) اس واقعہ کو بنیاد بنا کر ٹولسٹوئی نے اپنے تخیل کے تانے بانے سے ایک پس منظر تیار کیا۔ ٹولسٹوئی کو ایک ایسے مرکزی خیال کی تلاش تھی جس کے گرد گھومتے ہوئے کرداروں کے ذریعے وہ اپنے معاشرے کے زخموں پر سے پٹی کھول سکے اور دکھا سکے کہ اس کا معاشرہ کن زخموں سے چُور چُور ہے اور کون سی معاشرتی، روحانی اور اخلاقی بیماریاں معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے ایک دوست N.N. Strakhow کو جو خط لکھا ہے وہ اس بات کی گواہی بھی دیتا ہے۔ (1)

"If I wanted to say in words everything that I had it in mind to express in the novel I

should have to write the very novel that I have written all over again."(2)

(ترجمہ: اگر میں الفاظ میں ہر چیز کے بارے میں کہنا چاہوں جو کہ ناول میں اظہار کے لیے میرے دماغ میں تھا تو مجھے یہ ناول نئے سرے سے ایک بار پھر لکھنا پڑتا۔)

اس ناول میں ٹولسٹوئی نے سات نمایاں کردار تخلیق کیے ہیں، جو یہ ہیں:

(i) اینا کیرینینا (ii) اس کا شوہر الکسئی الکساندروچ (iii) آنا کا بھائی ہے ابلونسکی (iv) اس کی بیوی کٹی (Kitty) (v) بھاوج ڈولی (Dolly) جو سٹیوا ابلونسی (Stiva Oblonsky) کی بھاوج ہے (vi) آنا کا محبوب ورونسکی (Vronsky) (vii) لیون (Levin)۔ مندرجہ بالا کرداروں میں سے اینا کیرینینا، اس کا شوہر الکسئی الکساندروچ، آنا کا بھائی ابلونسکی یہ تو ایک کنبے کے چار افراد ہیں۔ اس کے علاوہ پانچواں کردار اینا کیرینینا کا محبوب ورونسکی، انھی میں دو کردار جو کہ لیون اور اُس کی بیوی کے ہیں یہ آخری دو کردار ہیں۔ یہ ناول کے ضمنی کردار ہیں مگر ناول میں بہت مضبوط اور دوسرے کرداروں پر اثرانداز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیون ایک جاگیردار ہے جو اس دور کے جبر کی علامت بھی ہے۔ اس کردار کے ذریعے ٹولسٹوئی نے اس دور کے کسانوں پر ہونے والے جبر، اس جبر سے جنم لینے والے مسائل اور ان کا حل بھی دکھانے کی سعی کی ہے، لیکن جاگیردار لیون کے مذہبی اور انقلابی نظریات میں ہمیں ٹولسٹوئی کے اپنے ذہن کی تصویر نظر آتی ہے۔

ناول کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ اس ناول کی ہیروئن آنا جو شادی شدہ ہے اور ایک بچے کی ماں ہے۔ ایک نوجوان ورونسکی سے محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسے محبت کہا جائے یا شیفتگی (Infatuation)۔ یہ سوال قاری کے ذہن میں ضرور اُبھرتا ہے کہ جس کا جواب اسے ناول کے مطالعے سے مل بھی جاتا ہے۔ ایک شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے کے عشق میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کا سبب جنسی ناآسودگی بھی ہو سکتا ہے اور یہ بات آنا کے کردار سے واضح ہوتی ہے جس کہ وہ ورونسکی سے جسمانی تعلق بھی قائم کرتی ہے اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی، سب کو معلوم ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کی عصمت ہی نہیں، اس کی شہرت بھی داغ دار ہو جاتی ہے۔ ورونسکی، کو آنا کے ساتھ کچھ دُور چل کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ ایک دوسرے میں کھو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاشرہ ان سے برگشتہ ہو جائے اور وہ تنہا رہ جائیں۔ وہ سوچتا ہے کہ

معاشرے سے بغاوت اپنی جگہ لیکن قطع تعلقی سے زندگی جس طرح جہنم بن گئی ہے اس میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہوگا۔

ورونسکی نے اپنے رویے سے آنا کو ان باتوں کا احساس نہ ہونے دینے کی کوشش کی، لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی، اس لیے کہ آنا کارینینا ایک حساس اور ذہین عورت تھی۔ اس نے جو راستہ اختیار کیا یعنی شوہر کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کے ساتھ شوہر جیسے تعلق استوار کر لیے تھے۔ اس کی بنا پر معاشرہ تو اسے پہلے ہی دُھتکار چکا تھا۔ اب اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ اس کا محبوب ورونسکی بھی اسے معاشرے کے دباؤ میں آ کر چھوڑ نہ دے۔ یہ خوف اس کے اعصاب پر اس طرح غالب آ گیا اور وہ اس بوجھ تلے اس قدر دب گئی کہ اس نے ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی۔

ناول کے آغاز میں آنا کے بھائی اور بھاوج کو اس بات پر جھگڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ اس کا بھائی اس کی بھاوج کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت میں دل چسپی لے رہا تھا جو اس کے بھائی کی ازدواجی زندگی کے لیے زہر قاتل تھی۔ آنا اس جھگڑے میں ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے دکھائی گئی ہے مگر بعد میں وہ خود اسی گناہ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کو اپنے ناول کا موضوع بنا کر ٹولسٹوئی نے درحقیقت انسان کی فطرت میں رچی بسی گناہ کی جبلت کو دکھانے کی کوشش کی ہے جس سے بڑے بڑے پارسا بھی اپنا دامن نہیں بچا پاتے۔ انسان کے کردار کی یہ کمزوری اسے پستی کی آخری حد تک بھی لے جانے سے گریز نہیں کرتی۔

عجیب بات ہے کہ معاشرہ ان لوگوں کو تو قصوروار نہیں ٹھہراتا جو مذکورہ نوعیت کے درپردہ گناہ میں ملوث ہوتے ہیں اور دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہونے دیتے۔ آنا سے یہ گناہ معاشرے کی اقدار سے بغاوت کر کے سرزد ہوا جس پر معاشرے نے اس کا بائی کاٹ کر دیا۔ اس کی ماں نے بھی اسے بہت کچھ بُرا بھلا کہا۔ حال آں کہ اس کی ماں بھی جوانی میں ایسی ہی تھی۔ خود اس دور کے معاشرے میں اعلیٰ طبقے کی خواتین میں شادی کے بعد ڈھکے چھپے معاشقے عام تھے، لہٰذا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنا کو اس معاشرے نے گناہ کی نہیں بلکہ اعترافِ گناہ کی سزا دی کیوں کہ آنا نے اپنے اس معاشرے پر بظاہر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا شوہر الکسی الکساندروچ کا کردار معاشرے میں ان سرکاری ملازمین کے رویے اور سائیکی کی نمایندگی کرتا ہے جو اعلیٰ سرکاری عہدے پر کام کرتے کرتے محض ایک مشین کے پُرزے کی مانند بن جاتے ہیں۔

ٹولسٹوئی نے اینا کیرینینا کے شوہر کی اس کے منصب کی ذمہ داریوں کے حوالے سے

جو تصویر کشی کی ہے اس سے اس دور کے زار روس کے طرز حکومت اور انتظامی طریقوں کی تصویر ہی بن جاتی ہے۔ جس میں کھو کر کوئی بھی شخص گھریلو مسائل کی جانب زیادہ توجہ نہیں دے سکتا۔ جب اسے اپنی بیوی کے معاشقے کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے غلط راستے پر جانے سے روکتا ہے، لیکن وہ راستہ نہیں بدلتی۔ ٹولسٹوئی نے الیکساندروچ کے اس معاملے کے ذریعے اس کی سوچ ناول کے قارئین تک پہنچائی ہے۔ الیکساندروچ اپنی بیوی آنا سے کہتا ہے:

''ایک وقت تھا جب میں نے اندرونی رشتوں کی بات کی تھی۔ اب میں ان کا ذکر نہیں کرتا۔ اب میں ظاہری رشتوں کی بات کرتا ہوں۔ آپ نے بدسلیقگی برتی اور میں نہیں چاہتا کہ دوبارہ ایسا ہو۔''۳

آنا پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اس سے علیحدگی چاہتی ہے مگر وہ شوہر الکساندروچ کی معاشرے میں بدنامی کے خوف سے اسے طلاق نہیں دیتا، لیکن وقت آگے بڑھتا رہتا ہے اور آنا اپنے محبوب ورونسکی کی ناجائز بچی کی پیدائش پر اپنے شوہر کے لیے بدنامی کا مزید باعث بن جاتی ہے تو بھی الکساندروچ اس خوف سے لوگوں کو جب پتا چلے گا کہ اس کی بیوی کسی اور کے بچے کی ماں بن گئی ہے تو لوگ اس پر (الکساندروچ) پر ہنسیں گے اور اسے تضحیک کا نشانہ بنائیں گے۔ الکساندروچ اس بچی کو اپنا نام دے دیتا ہے اور آنا کی موت کے بعد بھی اسے اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔

ٹالسٹائی نے الکساندروچ کے کردار کے ذریعے معاشرے کے ان لوگوں کی تصویر پیش کی ہے جو اپنے سرکاری فرائض کی بجا آوری میں اپنی ذات سے متعلق جو معیارات وضع کرتے ہیں ان پر خوف کے سائے منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ معاشرے کی نام نہاد اقدار سے مغلوب ہو کر ظاہرداری کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔

ٹالسٹائی نے ناول کی ہیروئن کے کردار کو اس کی باریک ترین جزئیات کے ساتھ تحریر کیا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک کتابی عورت نہیں بلکہ گوشت پوست کی ایک حقیقی عورت نظر آتی ہے۔ ٹولسٹوئی نے آنا کو جو ایک معزز خاتون تھی فرشتے کے روپ میں پیش نہیں کیا۔ اس میں بشری کمزوریوں کی گنجایش کا اعتراف کیا ہے۔ وہ اپنے معزز خاندانی حالات کی بلندیوں سے جذبات کے ریلے میں بہتی ہوئی جب اخلاقی پستی کی طرف لڑھک رہی ہوتی ہے تو اس صورت حال کے لمحے لمحے کی کیفیات اور اس کی ذہنی کشمکش کو الفاظ کے پیکر میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ہم آنا کو ایک جیتی جاگتی عورت کے روپ میں دیکھنے اور محسوس کرنے لگتے ہیں۔

آنا کارینینا ایک نارمل بیوی سے جب اپنے محبوب کی بانہوں میں رقص کرتے ہوئے لمحات گزارتی ہے تو اسے اپنے محبوب کے جسم

سے رغبت پیدا ہونے لگتی ہے جسے وہ بھلانے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہ کوشش ذہنی کشمکش کا روپ دھار لیتی ہے اور وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک بار ایسا ہوتا ہے کہ ٹرین میں سفر کے دوران میں جب وہ پیٹرز برگ سے واپس آ رہی ہوتی ہے تو وقت گزارنے کے لیے ایک ناول کا مطالعہ کر رہی ہوتی ہے۔ اسی ناول کا ہیرو اس کے لاشعور پر ورونسکی بن کر چھا جاتا ہے اور اس طرح وہ اس راستے پر لاشعوری طور پر قدم بڑھانے لگتی ہے جس پر جانے سے وہ اب تک اپنے آپ کو روکتی رہی ہے۔ ٹرین سے اُتر کر جب وہ اپنے گھر آتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کا شوہر حسن اور کشش کے معیار سے بہت نیچا ہے پھر جب وہ ورونسکی سے جسمانی تعلق قائم کر لیتی ہے تو اسے اپنے کردار کی پستی کا احساس ہوتا ہے، اس احساس کو ٹولسٹوئی نے برہنہ روح کا نام دے کر اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

''اپنے روحانی ننگے پن کے سامنے شرم نے انھیں کچل کر رکھ دیا اور اس پر بھی اثر ڈالا، لیکن اس سارے بھیانک پن کے باوجود جو قاتل اپنے مقتول کی لاش کے سامنے محسوس کرتا ہے، ضروری ہوتا ہے کہ اس لاش کے ٹکڑے کر کے اسے چھپا دیا جائے اور جو کچھ قاتل نے مقتول سے چھین لیا ہے اسے استعمال کیا جائے۔'' (۴)

ورونسکی (Vronsky) سے جسمانی تعلقات کی بات معاشرے کی آنکھوں سے چھپی نہیں رہ پاتی، بات دوستوں اور عزیزوں سے ہوتی ہوئی آنا کے شوہر تک پہنچتی ہے تو آنا کو احساس ہوتا ہے کہ بات بگڑ گئی ہے اور معاشرہ تو اسے بُرا بھلا کہہ ہی رہا ہے، اس کی اگر وہ پروا نہ بھی کرے تو اپنے شوہر سے کس طرح آنکھیں ملائے گی۔ یہ اس کا احساس تھا جس میں لحہ لحہ خوف شامل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے شوہر نے اس کی ناجائز بچی کو اپنا کہہ کر معاشرے کا منہ بند کرنا چاہا، لیکن آنا احساسِ جرم کے گڑھے میں دھنستی ہی چلی گئی اور اس کا خوف اسے اپنی زندگی کے خاتمے پر مجبور کرنے لگا۔ آنا کی اسی ذہنی کیفیت کو ٹولسٹوئی نے بڑی مہارت سے حوالہ قلم کیا ہے۔ خاص طور سے ان لمحات کی تصویر کشی تو بہت ہی ماہرانہ ہے جب آنا خودکشی کے ارادے سے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔ ٹولسٹوئی نے آنا کے دماغ میں چلنے والی شعور کی رو (Stream of Consciousness) کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔

''ان لوگوں نے کیسے مجھے دیکھا جیسے کسی بھیانک، ناقابلِ فہم اور قابلِ تجسس چیز کو دیکھتے ہیں۔ یہ آدمی دوسرے کو اتنے جوش و خروش کے ساتھ کس چیز کے بارے میں بتا سکتا ہے؟ انھوں نے دو راہ گیروں کو دیکھ کر

سوچا۔ کیا واقعی آدمی جو محسوس کرتا ہے، وہ دوسرے کو بیان بھی کر سکتا ہے؟ میں ڈولی (Dolly) کو بتانا چاہتی تھی اور اچھا ہی ہوا کہ میں نے کچھ نہیں بتایا اب یہ ہیں تو ان کو یہ گندی آئس کریم چاہیے۔ اس بات کو تو یہ لوگ یقینی طور پر جانتے ہیں انھوں نے دو لڑکوں کو دیکھ کر سوچا جو ایک آئس کریم والے کے پاس کھڑے تھے جس نے سر سے اپنی ہودی اتار لی تھی اور اپنے پسینے سے تر چہرے کو تولیے کے سروں سے پونچھ رہا تھا۔ میٹھی چیز مزے دار چیز ہم بھی چاہتے ہیں۔ ٹافی نہیں تو گندی آئس کریم ہی سہی اور ایسے ہی کٹی (Kitty) بھی۔ درونسکی (Vronsky) نہیں تو لیون (Levin) ہی سہی اور وہ مجھ پر رشک کرتی ہے ... بقا کے لیے جدوجہد اور نفرت، بس یہی چیزیں جو لوگوں کو وابستہ رکھتی ہیں۔ نہیں، آپ لوگ بے کار ہی جا رہے ہیں۔ خیال ہی خیال میں انھوں نے چار گھوڑوں کی بگھی میں جاتے ہوئے لوگوں کی ایک ٹولی سے کہا جو بظاہر شہر سے باہر تفریح کرنے جا رہے تھے... اپنے آپ کہیں نہیں جا سکتے۔"(۵)

درونسکی سے جسمانی تعلقات کی بات معاشرے کی آنکھوں سے چھپی نہیں رہ پاتی۔ ٹولسٹوئی نے آنا کے شعور کی رو کو جس طرح لفظوں کا روپ دیا ہے۔ اس کا تقابل اگر جیمز جوائس کی تحریروں سے کیا جائے تو ٹولسٹوئی اس سے بہت بلند نظر آتا ہے۔ ٹولسٹوئی کی اس خوبی کو Vladimir Nabokov نے بھی سراہا ہے۔

In Tolstoy the device is still in its rudimentary form with the author giving some assistance to the reader but in James Joyce the thing will be carried to an extreme stage of objective record." (6)

(ترجمہ:۔ ٹولسٹوئی نے جو اسلوب اختیار کیا وہ ابھی اپنی ابتدائی حالت میں ہے جس کے ذریعے مصنف اپنے قاری کو سہولت بہم پہنچاتا ہے، لیکن جیمز جوائس کے ہاں یہی چیز معروضی ریکارڈ کی آخری حد تک جا پہنچتی ہے۔)

ٹالسٹائی کے اُسلوب تحریر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ آنے والے واقعات کی طرف پہلے سے لطیف سا اشارہ دینا ضروری سمجھتا ہے تاکہ قاری جب اسی واقعہ تک پہنچے تو اس کے ذہن میں کوئی ابہام، اُلجھن یا اجنبیت نہ رہے۔ اس کی مثال اس واقعہ سے دی جا سکتی ہے کہ آنا جب پہلی بار ماسکو کے ریلوے اسٹیشن پر آتی ہے تو دیکھتی ہے کہ ایک آدمی اپنی بے احتیاطی سے ٹرین کے نیچے آ کر ہلاک ہو گیا ہے۔ اسے دیکھ کر آنا کہتی ہے "اوہو یہ بُرا شگون ہے۔"(۷) آگے چل کر آنا خود بھی

ایسے ہی حادثے سے دوچار ہو جاتی ہے یعنی وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ٹرین کے سامنے آ کر خودکشی کر لیتی ہے تو پڑھنے والے کے ذہن میں اسی واقعہ کا فلیش بیک ہوتا ہے جب ماسکو کے ریلوے اسٹیشن پر ایک شخص ٹرین سے کچل کر ہلاک ہو گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ بے خبری کی موت تھی جب کہ آنا کو خبر تھی کہ وہ جو کچھ کرنے جا رہی ہے اس کا نتیجہ بھی موت ہے۔ اس واقعہ سے اس دور کے معاشرے کے اعتقادات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مذہبی سماج ہو یا غیر مذہبی سماج اس میں اخلاقیات کا ضرور عمل دخل ہوتا ہے اور جب کسی کو اپنے گناہوں کا احساس شدت کے ساتھ ہونے لگتا ہے تو وہ اس گناہوں کے احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے اور اپنے ضمیر کی تسکین و طمانیت کے لیے خودکشی میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ آنا کارینینا نے بھی ایسا ہی کیا اس نے گناہوں کے عوض موت کو گلے سے لگا لیا۔ اس طرح گناہوں کا بوجھ موت کی صورت منتج ہوا۔ انسانی تاریخ میں بہت سے معاشروں میں گناہوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بعض انسانوں نے خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔ ٹولسٹوئی کے عہد میں یہ عنصر عقیدے کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی ایک مثال اینا کیرینینا کا کردار ہے۔

ٹالسٹائی اپنے دور کے کسانوں اور مزدوروں پر ہونے والے جبر اور سختیوں کو اپنے دل میں اس طرح محسوس کرتا تھا جیسے یہ سب اس کی ذات پر بیت رہا ہے۔ وہ زندگی بھر ان مظلوموں کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوششیں کرتا رہا جس کا عکس اس کے ناولوں اور کہانیوں میں واضح طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی طرح اس کے اسلوب کی انفرادیت بھی قائم ہوتی ہے۔ لینن نے ٹولسٹوئی کے بارے میں کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اور کیا آپ جانتے ہیں کہ اس میں حیرت انگیز بات کیا ہے؟ اس سے پہلے کسی نے ادب میں حقیقی کسان کو پیش نہیں کیا۔ ٹولسٹوئی نے جاگیردار لیون کی سوچ کے ذریعے اس دور کے کسانوں کے مسائل اور جاگیرداروں کے ظلم کا پردہ چاک کیا۔ غربت بھی کسانوں کا ایک مسئلہ ہے لیون کسانوں کی غربت کے خاتمے کی سوچ رکھتا ہے کسان جب مال دار ہوگا تو پھر وہ دل جمعی سے کام کر سکے گا۔ جاگیردار، کسانوں کو مساوی حصہ نہیں دیتے تھے۔ ٹولسٹوئی نے لیون کے کردار کے ذریعے اس سوچ اور رویے کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ لیون کا View of Point یہ ہے کہ روسی کسان کو اس کی مخصوص جبلت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ کسان کے مسائل اور خصوصیات کو سمجھے بغیر روس زراعت کے میدان میں خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتا، لہٰذا جاگیردار کو کسان کے مسائل کو سمجھنا ہوگا۔ کسان کے لیے غربت بہت بڑا مسئلہ ہے اس کی

معیشت مضبوط ہوگی تو وہ ذوق شوق سے کام کرے گا زرعی ترقی میں اپنا کردار ادا کرے گا۔ اس نے جاگیردار کے استحصالی رویے اور منفی فکر کو Condemn کرتے ہوئے لیون کے کردار کے ذریعے کسان کے ایشوز کو اجاگر کیا ہے۔: ''ہم اپنے محنت کشوں کی خصوصیات کو، ان کی عادتوں کو سمجھنا نہیں چاہتے۔۔۔ وہ اپنی رائے پر مصر تھا کہ روسی کسان نہ صرف سور ہے، بلکہ اپنے سور پن پر نہایت نازاں اور خوش بھی ہے۔ روسی کسان کو اس سور پن سے نکالنے کے لیے اقتدار اور طاقت کی ضرورت ہے، جو ہے نہیں، اس کام کے لیے ڈنڈے کی ضرورت ہے، لیکن ہم اس درجہ روشن خیال ہوگئے ہیں کہ ہم نے ہزاروں ہزار سال سے آزمائے ہوئے قدیم ڈنڈے کو پھینک دیا ہے اور اس کی جگہ اچانک وکیلوں اور جیل خانوں پر تکیہ کرنے لگے ہیں۔ جہاں ناکارہ، بدکار اور شری کسان مفت میں بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑتے ہیں، کھانے کو بڑھیا سوپ ملتا ہے، اور سانس لینے کو کئی کئی مربع فٹ تازہ ہوا مہیا کی جاتی ہے۔ '' آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں، لیون نے گفتگو کا رخ پھر اسی بنیادی سوال کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا کہ ہم محنت کشوں کی طرف ایسا رویہ اپنا ہی نہیں سکتے، جس کی مدد سے پیداواری صلاحیت میں اضافہ ممکن ہو۔'

'روسی کسانوں کے سلسلے میں تو کبھی ایسی نوبت آ ہی نہیں سکتی۔ نہ اقتدار ہے نہ ڈنڈا ہے! جاگیردار نے کہا'۔۔ کسان غریب ہے، ان پڑھ ہے، یہ بات تو ہم بھی اس طرح، گویا، جوتے کے تلے میں دیکھ سکتے ہیں، جس طرح دیہاتن ماں سایہ دیکھ سکتی ہے۔ کیوں کہ اس کا بچہ مسلسل چیخ رہا ہے، لیکن اس کی مصیبت میں، غریب اور جہالت میں، یہ اسکول کس طرح اس کی مدد کریں گے۔۔ یہ بات اسی حد تک ناقابل فہم ہے جس حد تک یہ بات ناقابل قبول ہے کہ مرغیاں چیچوں کا علاج کرسکتی ہیں۔ علاج تو اسی چیز کا کیجیے جس کی وجہ سے وہ غربت کا شکار ہے - - - البتہ معمر جاگیرداروں کی باتوں، اور اس کے اخذ کردہ نتائج میں سے کچھ باتیں اور نتائج ایسے تھے، جن پر سنجیدگی سے غور کرنا ممکن تھا۔ لیون کو جاگیردار، کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی اور پھر وہ خود اپنے جواب یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

'ہوں! ان سے کہنا چاہیے تھا: آپ کہتے ہیں کہ ہماری زراعت ترقی نہیں کرسکتی، کیوں کہ کسان کو ہر اصلاح سے نفرت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہ اصلاحات اقتدار اور زور زبردستی کی مدد سے کی جائیں۔ بھئی اگر اس سدھار، ان اصلاحات کے بغیر زراعت قطعی بیٹھ جاتی، تب تو موصوف کی بات درست ہوتی، لیکن زراعت تو بہرحال آگے بڑھتی رہی

ہے، جہاں مزدور اور کسان اپنے پرانے ریت رواج کے مطابق کاشتکاری کرتے آئے ہیں۔ جیسے اس بوڑھے کسان کے ہاں، جس سے نصف سفر کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ زراعت سے ہماری اور آپ کی بے اطمینانی اس بات کا ثبوت ہے کہ قصور ہمارا ہے یا کسانوں کا ہے۔ ہم اپنے روسی مزدور کسان کی خصوصیات کو قطعی نظر انداز کر کے زبردستی اپنے یعنی یورپ کے طریقے سے کام کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ محنت کی قوت کو محض ایک مثالی محنت کی قوت کی طرح دیکھنے کے بجائے اسے روسی کسان اور اس کی مخصوص جبلت کی روشنی میں کیوں نہ دیکھیں، اپنی کاشتکاری کو اس کے مطابق ترقی کیوں نہ دیں؟ مجھے ان سے کہنا چاہیے تھا کہ "ذرا سوچیے، اگر ہم اس لائن پر کاشتکاری کریں جس پر وہ کسان کرتا ہے، کوئی ایسا طریقہ تلاش کر سکیں جس کے تحت ہمارے کسانوں کو دلچسپی پیدا ہو سکے۔۔۔ کام ہیں، اور کام کو آگے بڑھانے میں۔۔۔ اور اگر ہم ایجادات کے سلسلے میں کوئی ایسی غیر معمولی درمیانی راہ تلاش کر سکیں جسے کسان بھی منظور کر سکے تو۔۔۔ اگر ہم یہ سب کر لیتے ہیں تو زمین کی پیداوار فی ہیکٹر دوگنا، بلکہ تین گنا ہو جائے گی، اور وہ بھی زمین کی طاقت کو کھوئے بغیر۔۔۔ آدھا آدھا تقسیم کر لیجیے۔ نصف مزدور اور کسان کو دیجیے، نصف آپ رکھیے۔ آپ کا یہ نصف حصہ بہر حال پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہوگا، اور محنت کشوں کو بھی زیادہ مل سکے گا۔ اس منزل کو پانے کی خاطر ہمیں کاشتکاری کا اپنا معیار کم کرنا پڑے گا، اور کھیت کی کل پیداوار میں کسان کی دلچسپی کو جگانا ہوگا۔ یہ کام کیسے کیا جائے۔۔۔ یہ تو خیر تفصیلات کا سوال ہے، لیکن اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ ممکن ہے، اور ضرور ممکن ہے۔" (۸)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لیون کی سوچ میں ٹولسٹوئی کی اپنی سوچ بھی یکجا ہو گئی ہے۔ لیون کے کردار میں ہم ٹولسٹوئی کی اپنی سوچ کو کارفرما دیکھتے ہیں کہ اس دور کا نظام کسان کا استحصال کرنے کے لیے بنا تھا جسے جاگیردار اپنی عیاشیوں میں مزید اضافے کے لیے مضبوط تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ لیون کی طرح وہ سمجھتا تھا کہ زراعت کا کلیدی عنصر کسان اور اس کی محنت ہے نہ زمین، ہل، موسم اور کھاد وغیرہ۔ لیون بظاہر ایک جاگیردار ہے، لیکن اس کے اندر ایک مصلح اور کسانوں کا درد آشنا فرشتہ موجود ہے جو کسانوں کے حالات کار کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ عملی کام بھی کرتا ہے۔ وہ کسانوں کے ساتھ فصلوں کی کٹائی میں بھی شامل ہوتا ہے اور جسمانی محنت بھی کرتا ہے۔ اس کے دو فائدے اسے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے ماتحت کام کرنے والے کسانوں اور مزدوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ زیادہ تندہی سے کام کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ اسے احساس ہوتا ہے کہ جو لوگ جسمانی

محنت سے گریز کرتے ہیں اور آرام و عیاشی میں اپنا وقت گزارتے ہیں ان کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ اسی لیے وہ میڈیکل ڈکشنری میں ایک نئی اصطلاح شامل کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کام وہ دوا ہے جس سے آرام پسندی اور کاہلی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ دراصل لیون جو کچھ سوچتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے، وہ ٹولسٹوئی کا اپنا زاویہ نظر ہے جسے اپنے معاشرے کے اشرافیہ کی سہل پسندی اور عیش کی زندگی اچھی نہیں لگتی۔ اس کے مقابلے میں وہ محنتی کسانوں کے معمول اور صحت بخش معمولات زندگی کی تعریف کرتا ہے اور ایک جگہ لیون سے یہ بات کہلواتا ہے۔

''ہم گاؤں میں کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں کو ایسی حالت میں رکھیں کہ کام کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے لیے ہم ناخن کاٹ دیتے ہیں اور کبھی کبھی آستین بھی چڑھا لیتے ہیں اور یہاں لوگ ناخن بڑھا لیتے ہیں جہاں تک بڑھ سکیں اور آستینوں کو طشتریوں جیسے بٹنوں سے بند کر لیتے ہیں تاکہ ہاتھوں سے کچھ کام کیا ہی نہ جا سکے۔''(۹)

ٹالسٹائی نے اشرافیہ کی فضول خرچیوں اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے اور اس پس منظر میں لیون کے خیالات اس طرح بیان کیے ہیں۔

''لیکن جب سوروبل کا اگلا نوٹ اس نے رشتہ داروں کی ایک دعوت کے لیے سامان خریدنے کے واسطے بھنایا جو اٹھائیس روبل کا تھا تو لیون کو یہ خیال تو ہوا کہ اٹھائیس روبل کے معنی ہوتے ہیں دس کوارٹ جئی، جو کاٹی جاتی تھی۔ گٹھوں میں باندھی جاتی تھی، گاہی جاتی تھی، اوسائی جاتی تھی، چھانی جاتی تھی اور بوروں میں بھری جاتی تھی اور صاف کرنے میں لوگ تھکتے تھے اور پسینہ بہاتے تھے، پھر بھی یہ اگلا نوٹ خرچ کرنا آسان تر تھا۔''(۱۰)

لیون کا کردار ٹولسٹوئی نے بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ دراصل اپنے معاشرے کی ناہمواریوں کے خلاف جو کچھ بھی ٹولسٹوئی سوچتا ہے اور کسانوں کو اس کا فائدہ پہنچانا چاہتا ہے وہ سب کچھ اس نے لیون کے کردار کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ لیون مخلص ہے، وہ کسانوں کو جاگیرداروں کے استحصال سے بچانا چاہتا ہے اور جب وہ یہ بات کسانوں سے کہتا ہے تو کسان اس کی بات پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس لیے کہ لیون خود بھی تو جاگیردار ہے بلکہ کسان تو اس کی نیت پر شبہ کرتے ہیں کہ وہ ہمدردی کے نام پر استحصال کرنا چاہتا ہے۔ لیون کے کردار کا دوسرا رُخ اس کا باطن ہے جو اس کے ظاہر کی طرح تسلسل کے ساتھ کسی بہتری کی تلاش میں ہے۔ اس کا مسئلہ تلاشِ حق ہے۔ بدقسمتی سے وہ ایسے معاشرے میں زندہ ہے جہاں کسان طبقہ جاگیرداروں کے ہر عمل کو شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے جس کا ذکر وہ پادری سے بھی کرتا ہے، لیکن اس کا حل نہ تو اسے فلسفیوں کی

کتابوں میں مل پاتا ہے اور نہ خالق کائنات کی عبادت میں نظر آتا ہے۔ لیون اپنے داخل کی تمام تر کشمکش کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

''کیا میں عقل سے اس نتیجے تک پہنچا تھا کہ مجھے اپنے پڑوسی سے محبت کرنی چاہیے اور اس کا گلا نہیں گھونٹنا چاہیے؟ مجھے بچپن میں یہ بتایا گیا اور میں نے خوشی سے اس پر یقین کر لیا، اس لیے کہ مجھے وہی بتایا گیا تھا جو میرے دل میں پہلے سے موجود تھا اور اسے دریافت کس نے کیا؟ عقل نے نہیں۔ عقل نے تو بقا کے لیے جدوجہد اور قوانین دریافت کیے جن کا تقاضا ہے کہ میری خواہشوں کی تکمیل و تشفی میں جتنے لوگ بھی مخل ہوں، ان سب کا گلا گھونٹ دو۔ یہ ہے عقل کا اخذ کردہ نتیجہ اور دوسرے سے محبت کرنے کی دریافت عقل نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ یہ بے عقلی ہے۔'' (۱۱)

یہاں پہنچ کر لیون پر وسیع النظری اور کشادہ قلبی کے در وا ہو جاتے ہیں۔ وہ نیکی، بھائی چارے اور محبت کی تبلیغ مسیحیت کے ایک محدود دائرے میں رہ کر کرنے کی بجائے عام انسانوں کے بارے میں سوچتا ہے۔

''اسے یاد آیا کہ جس چیز کو اس نے آنکھ سے اوجھل کر دیا ہے وہ کیا تھی۔ وہ یہ بات تھی کہ اگر الوہیت کا خاص ثبوت اس شے کا انکشاف ہے کہ نیکی کیا ہے تو یہ انکشاف کیوں صرف عیسائیت تک محدود ہے؟ اس انکشاف سے بودھوں اور مسلمانوں کا کیا تعلق ہے؟ وہ بھی تو نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور نیکی کرتے ہیں۔ اسے لگا کہ اس کے پاس اس سوال کا جواب ہے، لیکن وہ خود اپنے لیے بھی اس کا اظہار نہ کر سکا تھا۔'' (۱۲)

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ لیون کے کردار میں ٹولسٹوئی خود موجود ہے جہاں ٹولسٹوئی اپنا Point of View لیون کے حوالے سے بیان نہیں کر پاتا وہاں وہ اشرافیہ میں ہونے والی بحث و تمحیص کا سہارا لیتا ہے اور اس طرح مختلف موضوعات پر ٹولسٹوئی اپنی سوچ کا اظہار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ کلاسیکی علوم کو سائنسی علوم پر ترجیح دینے کا جواز اس طرح دیتا ہے۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس بات کا اعتراف نہ کرنا ناممکن ہے کہ زبانوں کی قواعد و تشکیل و ساخت کا علم حاصل کرنے کا عمل ہی روحانی ارتقا پر خاص طور پر مفید اور خوش گوار اثر ڈالتا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات سے انکار کرنا بھی ناممکن ہے کہ کلاسیکی ادیبوں کا اثر بہت ہی اعلیٰ درجے کا اخلاقی اثر ہوتا ہے جب کہ بدقسمتی سے نیچری سائنسوں کی تعلیم کے ساتھ وہ نقصان دہ اور جھوٹی تعلیمات وابستہ ہیں جو ہمارے عہد کے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' (۱۳)

[جاری ہے۔]

مدحتِ سردارِ جنت اور امجد حمید محسن

حیدرؓ، حسنؓ، حسینؓ کی زہراؓ بتولؓ کی
ہر بات باکمال ہے آلِؓ رسولؐ کی

.....

اصلاحِ شعر میں منقبت سے مراد ایسی نظم جس میں صحابہؓ کرام، اولیائے عظام، بزرگانِ دین اور صوفیا کرام کے اوصاف بیان کیے جائیں۔ مختلف پیغمبروں، فرشتوں پر لکھی گئی منظومات بھی مناقب کے ذیل میں آتی ہیں۔ حمد و نعت کے ساتھ منقبت کے نمونے بھی قدیم اردو شاعری میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ حمد و نعت کی طرح اہلِ بیتؓ اور صحابہؓ کرام کی سیرت و کردار پر جن شاعروں نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیے ہیں اُن میں نظیر آبادی، میر انیس، مرزا دبیر، غالب، امیر مینائی، احمد رضا بریلوی، محسن کاکوری اور جعفر بلوچ کے نام نمایاں ہیں۔ منقبت نگاری کے اس سلسلے کو آج بھی کئی شعرا جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایسے شعرا کی فہرست میں امجد حمید محسن کا شمار بھی ہوتا ہیں، جو اپنے عہد کے ایسے منجھے ہوئے شاعر ہیں جن کا شعری اسلوب اپنے ہم عصروں سے منفرد دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر شاعری کے ذریعے پاکیزہ جذبات اور سنجیدہ فکر کا پرچار کیا ہے۔ ان کے اب تک چار شعری مجموعے مختلف عنوانات سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اہلِ دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں زمانہ طالبِ علمی سے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ یوں ان کا تخلیقی سفر تین دہائیوں سے زائد عرصے تک پھیلا ہُوا ہے۔ اس دوران انھوں نے شاعری کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی جن میں غزل، نظم، ہائیکو، ماہیا، حمد، نعت، سلام اور منقبت شامل ہیں۔ وہ ہر وقت تخیل کے طلسم میں رہتے ہیں اور نت نئے اشعار لوحِ قرطاس پر اُتارنے میں مگن رہتے ہیں۔ ان کے ہاں نعت کے گلدستوں میں الفاظ

صدام ساگر

پھولوں کی پتیوں کی مانند مہکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ:

رسولِ رحمت کے ذکر کا فیض ہے یہ محسنؔ
مرے لبوں پہ ہیں لفظ تازہ کلام اعلیٰ

....

امجد حمید محسنؔ اپنی نعتوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے اپنی محبت اور عقیدت کا جس طرح اظہار کرتے ہیں اُسی جذبے سے وہ رسولِ رحمت کی آلؓ کا تذکرہ بھی مناقب کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ ''مدحتِ سردارِ جنت'' ان کے مناقب کا اولین مجموعہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے ایک روحانی سکون و اطمینان میرے دل میں اُترتا گیا، نور کی کرنیں لفظ لفظ سے روشنی بکھیرنے لگیں، ہر شعر سے محبت کے پھولوں کی مہک سانسوں کو معطر کرنے لگی۔ ان کے اس مجموعہ کلام میں حمد، نعت، منقبت، سلام اور مناقب شامل ہیں۔ ان کے کلام میں سوچ و فکر کی گہرائی اور گیرائی موجود ہے، جو ان کے دلی جذبات و احساسات و خیالات کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور ان کے فنِ شاعری کے اسلوب بیان کے کمالات کو بھی سامنے لاتے ہیں۔

''مدحتِ سردارِ جنت'' میں پہلی منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت و اخلاص، شجاعت و بہادری، علم و حکمت کے حوالے سے ہے۔ اس منقبت میں ان کا شعری اسلوب بعض مناقب سے مختلف نظر آتا ہے۔ جس کا مطلع مجھے بہت پسند ہے۔

اُس سمت علیؓ حیدر اُس پار علیؓ حیدر
ہر دور نے مانا ہے سردار علیؓ حیدر

....

اس کتاب میں دوسری منقبت سیدہ کائنات حضرت فاطمہؓ زہرا کے حوالے سے ہے، جس میں آپؓ کی سیرت کی شان و عظمت کو بڑی عاجزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ جب منقبت لکھتے ہیں تو صلوات کا ورد ان کی زبان پر جاری رہتا ہے۔ امجد حمید محسنؔ جس حُسنِ قلم سے سیدہؓ کائنات کی منقبت لکھتے ہیں وہ قلم بھی خود پر نازاں ہے اس شعر کے مصداق:

فاطمہؓ کی منقبت کا کیا حسیں آغاز ہے
جس قلم سے لکھ رہا ہوں اُس قلم کو ناز ہے

اسی منقبت کا مقطع دیکھیے:

منقبت یہ فاطمہؓ کی جب بھی محسنؔ نے پڑھی
ہر زباں پر تھا یہی کہ کیا عجب انداز ہے

....

''مدحتِ سردارِ جنت'' میں امجد حمید محسنؔ کا خاص موضوع نواسہ رسولؐ، جگر گوشہ بتولؓ، فرزندِ علیؓ حیدر، خلیفہ پنجم سیدنا امام عالی مقام حضرت امام حسنؓ کی شخصیت، سیرت و کردار اور فضائل و شمائل کے مناقب شامل ہیں۔ جسے وہ بڑے احسن طریقے کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اپنے امام کے حضور اپنی محبتوں اور عقیدتوں کے گلدستے پیش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ارشد محمود ناشاد رقم طراز ہیں

کہ "شاعر نے امام عالی مقام کے ساتھ اپنی محبت وعقیدت کے رنگوں کو نہایت عمدگی کے ساتھ مناقب کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان مناقب میں امام حسنؓ کی سیرت کے احوال، اُن کے سراپے کی خوش رنگی اور اُن کے اوصاف و کمالات کی روشنی جابجا جلوہ فگن ہے۔ شاعر نے استمداد اور فریاد کے رنگ، حاضری وحضوری کی تمنا اور زیارت کی آرزو کو نہایت سوز و گداز اور عقیدت و احترام سے شعر میں گوندھ دیا ہے۔"

"مدحتِ سردارِ جنت" امجد حمید محسن کا تخلیقی اور تاریخی کارنامہ ہے۔ جسے ہم بارش کا پہلا قطرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان سے قبل بہت سے شعرا کے ہاں امام حسنؓ کی سیرت و فضائل پر چند مناقب پڑھنے کو ملتے ہیں مگر الگ سے کسی بھی شاعر کا کوئی دیوان نہ آسکا، امجد حمید محسن نے اپنے اس مجموعہ مناقب میں امام حسنؓ کی صداقتوں، شجاعتوں، سخاوتوں، علم و حکمتوں کے پھول گلستانِ سخن میں کھلا دیئے ہیں جس کی خوشبو تا قیامت تک محسوس کی جا سکے گی۔ مناقب کہتے وقت وہ انتخابِ الفاظ کا بطورِ خاص خیال رکھتے ہیں، انھوں نے ردیفوں کے ہم وزن قوافی کا برمحل استعمال کیا ہے، مناقب کے اشعار رقم کرنے میں یہ احتیاط نہایت ضروری ہے کہ جذبے کی صداقت کیساتھ ساتھ الفاظ کے مزاج کو سمجھنا اور ان کے برمحل استعمال کا سلیقہ مناقب کے تقدس کو دوبالا کر دیتا ہے۔ کیونکہ مناقب شاعری عام شاعری سے مختلف ہوتی ہے۔ امجد حمید محسن آدابِ مناقب کی پاسداری کرنے میں کافی حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا مجموعہ مناقب دیوانِ عقیدت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

چمکا ہے ترے ذکر سے دیوانِ عقیدت
مہکا ہے مناقب سے چمن زار موذت
زم زم سے بھی لکھے جو قلم اہلِ قلم کا
تحریر نہ ہو پائیں گے اوصافِ فضیلت

.....

"مدحتِ سردارِ جنت" میں شامل مناقب میں امجد حمید محسن اپنی عقیدت کا اظہار غزل کی ہیئت میں کرتے ہیں، ہیئت سے مراد انداز و بیان کی وہ صورت جو فنی اور تکنیکی خصوصیات جس کے سبب شعری تخلیق کی شناخت کی جا سکے۔ کیونکہ غزل اپنی ہیئت کے اعتبار سے "نظم" ہے اور اپنے مضامین کے اعتبار سے خاص مزاج رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مناقب شعری لغت و محاورہ میں نظموں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ امجد حمید محسن نے اپنے شیریں انداز و بیان اور شعری تخلیق سے اپنی بعض مناقب کو نظم کی شکل دی ہے۔ جس میں ان کی فنی اور تکنیکی خصوصیات کا خوب ادراک ہوتا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر ریاض مجید اور اکرم کنجاہی اپنی آرا میں دلیلیں پیش کر چکے ہیں۔ اس مجموعہ مناقب میں پروفیسر شوذب کاظمی کا مقدمہ کے علاوہ اقبال نجمی، سرور ارمان اور طاہر سلطانی کی آرا کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ایک منقبت سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مدحت سلام اور قصیدے نصاب میں
مولا حسنؓ کا ذکر ہے دل کی کتاب میں
عجز و نیاز ، سادگی ، صبر و رضا ، وقار
زہراؑ کی خوبیاں ہیں اس عالی جناب میں

....

حضرت امامِ حسنؓ پندرہ رمضان سن تین ہجری بمطابق ۶۲۴ عیسوی کو دنیا میں تشریف لائے۔ جس پر آپؓ کے نانا رحمتِ دو جہاں، امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو اپنی گود میں اٹھاتے ہوئے شکرِ خدا کے بعد کلمہ توحید ادا کیا۔ پھر آپؓ کے کان میں اذان دی دوسرے میں اقامت فرمائی اور پھر زبان رسالت مآب سے فرمایا میں اس بچے کا نام حسنؓ رکھتا ہوں۔ امامِ حسنؓ کی پیدائش کا تذکرہ ان کی اس مناقب میں خوب دیکھا جاسکتا ہے۔

گلِ زہراؑ ہے مسکایا مبارک ہو مبارک
ہے جانِ مصطفیٰؐ آیا مبارک ہو مبارک

....

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالی شان ہے کہ ''جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے وہ میرے ان دونوں بیٹوں سے محبت کرے، مزید آپؐ نے فرمایا میرے بیٹے حسنؓ اور حسینؓ سردارِ جنت ہیں۔'' حضرت امام حسنؓ کی اعلیٰ صفات میں اُن کا خوبصورت سبز کرتا، عالی شان دسترخوان اور بے مثل سخاوت رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ امامِ حسنؓ کی سیرت و فضائل کا بہترین نمونہ ''مدحتِ سردارِ جنت'' امجد حمید محسنؔ کا مجموعہ مناقب ہے۔ جو ہر حوالے سے ایک منفرد فن پارہ ہے۔ ان مناقب کا مکمل مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ میرے لیے باعثِ افتخار بات یہ ہے کہ ''مدحتِ سردارِ جنت'' کی مشینی خطاطی کے دوران اس مسودے کو کئی بار پڑھنے کا اعزاز مجھ خاکسار کو حاصل ہوا۔ ان کے اس مجموعہ مناقب پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہوگا۔ اس مجموعہ مناقب میں وہ کئی مقامات پر درِ حسنؓ پر حاضری کے طلب گار نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے کچھ ماہ بعد انھیں اللہ نے اپنے گھر بیت اللہ اور درِ مصطفیٰؐ، درِ زہراؑ اور درِ حسنؓ کی زیارت کا شرف بھی بخشا۔ اللہ کرے ان کے اولین مجموعہ مناقب ''مدحتِ سردارِ جنت'' کو دربارِ رسالت مآبؐ میں قبولیت کی سند نصیب ہو اور اُن کے لیے آخرت میں ذریعہ شفاعت بھی ٹھہرے، اللہ ان کے مناقب کا مبارک سفر اسی شان و وقار کے ساتھ جاری رکھے۔ آخر میں حضرت امام حسنؓ کی شہادت کا ذکر کرتا چلوں کہ ان کی شہادت ۲۸ صفر المظفر ۵۰ ہجری کو ہوئی۔ جسے امجد حمید محسنؔ اپنے اشعار کی صورت میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

محروم لوگ ہو گئے شفقت سے اے حسنؓ
دل رو رہا ہے تیری شہادت سے اے حسنؓ
تیرے بدن کو اپنا بدن مصطفیٰؐ کہیں
کتنی مشابہت تھی رسالت سے اے حسنؓ

☆☆☆☆☆

اشرف صبوحی کی گلی

اشرف صبوحی ڈپٹی نذیر احمد کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے پاکستان کے نامور ادیب، صحافی، افسانہ نگار اور مترجم تھے۔ جنھوں نے ادب کی تقریباً تمام اصناف میں اپنا لوہا منوایا۔

حال ہی میں آپ کا مشہور زمانہ مضمون گلی پڑھا جس میں ہمارے روایتی گلی محلوں کی تہذیب وتمدن کی عکاسی اس قدر خوبصورت انداز سے کی گئی تھی کہ وہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

جیسے جیسے نئی نئی سوسائٹیز کا قیام عمل میں آتا گیا ویسے ویسے گلی محلوں کی روایات دم توڑتی گئیں۔ میں سمجھتی ہوں گلیوں کے ختم ہونے کی وجہ سے تربیت، تحفظ، شرم و حیا، کلچر، اپنائیت، میل جول اور شائستگی بھی تقریباً معدوم ہو کر رہ گئی۔

اشرف صبوحی (مرحوم) کے اس جملے میں کتنی صداقت پوشیدہ ہے

''یہ گلی بھی کتنی غریب نواز ہوتی ہے کتنی سمائی ہے اس میں۔ اے گلی تیرا ہی آسرا۔''

اور کیا ہی عمدہ جملہ ہے:

''مفلسی اور گلی کا چولی دامن کا ساتھ ہے''

حقیقت میں گلی غریبوں کا دکھ سکھ سمجھتی اور پہچانتی ہے۔ کیا زمانے ہوا کرتے تھے جب گلی میں کسی کے گھر شادی ہوتی تھی تو پوری یوں لگتا تھا جیسے پوری گلی میں بسنے والے ہر گھر میں شادی ہے۔ کہیں سے بستر منگوائے جاتے، تو کہیں سے برتن، کسی کے گھر مہمانوں کو ٹھہرانے کا بندوبست کیا جاتا تو کسی کے احاطے میں تقریب کی ادائیگی کا بندوبست بخیر وخوبی کیا جاتا۔ غریب کی بیٹی کی شادی میں پورا محلّہ اپنی

سیدہ آمنہ ریاض

خدمات حاضر کرتا۔ یوں سمجھ لیجیے یہ گلیاں کم خرچ بالانشین ہونے کا منظر پیش کرنے میں پیش پیش تھیں۔ ان گلیوں کی ہی وجہ سے نہ تو نفسیاتی مسائل ہوتے اور نہ ذہنی دباو۔ نہ انسان تنہائیوں کا شکار ہوتا اور نہ ہی نام نہاد دوائیوں کے پھکے مارنے پڑتے۔

پھر جب تہذیب نے کروٹ بدلی تو طور طریقوں میں بھی بدلاو آ گیا۔ جیسے جیسے لوگ جدت پسند ہوتے گئے ویسے ویسے گلی کلچر بھی ختم ہوتا چلا گیا۔ اس جدت پسندی میں اب ہر شخص کی اپنی اپنی دنیا ہے، اپنی خوشی ہے، اپنا غم ہے اور اپنا مزاج ہے۔ لوگ بہت پروفیشنل ہو چکے ہیں یا شائد بہت سمجھدار۔

اب اشرف صبوحی کی وہ گلی جس میں بچے بے فکر ہو کر باہر گیڑیاں، کبڈی، گلی ڈانڈا اور کوڑا جمال شاہی کھیلا کرتے تھے، اب ناپید ہے۔ اشرف صبوحی کی گلی میں بھیڑیے نہیں تھے۔ اشرف صبوحی کی گلی میں مائیں بے فکر تھیں۔ اشرف صبوحی کی گلی میں سرشام بڑے بوڑھوں کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ اشرف صبوحی کی گلی میں کیا امیر کیا غریب، سب کے دکھ سانجھے تھے۔ اشرف صبوحی کی اس گلی میں بلا کی معصومیت اور سادگی تھی۔

اشرف صبوحی کی وہ گلی اب ملیامیٹ ہو چکی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی کالونی بن چکی ہے۔ جس میں کسی گھر کا دروازہ گلی کی جانب نہیں کھلتا۔ اب گلی گلی پنچائتیں بھی نہیں لگتیں۔ ظاہر ہے بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اس بدلاو میں کچھ چیزیں سراہے جانے کے قابل ہیں تو کچھ قابل تنقید۔ ہاں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ نئی نسل ان روایتی جذبوں، میل ملاپ، تہذیب اور کلچر کا وہ لطف نہیں اٹھا سکتی جو کہ اشرف صبوحی کی گلی میں ملتا تھا۔ جو وسعت، گہرائی، مشاہدہ اور تجربہ اس گلی کے باسیوں کو قدرتی طور پر حاصل ہوا، نئی نسل ان سے محروم ہے۔ اب تو آسائشیں ہی آسائشیں ہیں۔ کنالوں پر محیط بنگلے نما گھر، شاندار اور چمچماتی گاڑیاں، نیا لائف اسٹائل، سہولت ہی سہولت۔ لیکن جو تربیت اور افزائش محرومی میں ہوتی ہے اس کی مثال آسائشوں میں نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔

اشرف صبوحی کے ان جملوں نے تو پوری حقیقت ہی بیان کر دی۔ فرماتے ہیں:

"دیکھا جائے تو ہماری گلیاں ہماری تہذیب کے گہوارے ہیں۔ تہذیب نے انہی میں جنم لیا۔ یہیں گھٹنوں چلی اور پروان چڑھی اور جب اسے چلنا آ گیا تو وہ ان گلیوں سے نکل کر کوٹھیوں اور فلیٹوں میں جا بسی۔"

اشرف صبوحی کی گلی کو کھو کر ہم نے بہت کچھ پا لیا ہے۔ لیکن جو کھو دیا وہی سب کچھ تھا---

☆☆☆☆☆

''وہ کھڑکی اب بھی کھلتی ہے''

ایک محفل میں احمد ظہور صاحب کی نظم ''سایہ'' ان کی اپنی زبانی سنی، جو ان کی شخصیت اور شاعری سے تعارف کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس نظم کا اختتام ''وہ کھڑکی اب بھی کھلتی ہے'' کے مصرعے پر ہوا۔ یہ اختتام اگرچہ ڈرامائی کیفیت کا حامل ہے لیکن تاثیر میں اتنا مکمل اور بھرپور کہ شاید اس کا اثر کبھی پرانا نہ ہوگا۔ اس تاثیر کو مل کر محسوس کرتے ہیں:

مہینوں اور سالوں کو گزرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے
وہ کھڑکی اب بھی کھلتی ہے
وہ لہراتا ہے آنچل بھی
مگر واں تم نہیں ہوتیں..... یہاں میں بھی نہیں ہوتا
یہاں زینے پر جو لڑکا کھڑا
اکثر ہمیں بے چین کرتا ہے
جسے تم دیکھ کر کڑھتی ہو
اکثر میں بھی کڑھتا ہوں
یہ اپنا ہی تو سایہ ہے، یہ اپنا ہی تو بیٹا ہے!!؟

.....

ایک شام، پنڈی سے اسلام آباد واپس آتے ہوئے احمد ظہور صاحب سے ذرا تفصیل سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ عنقریب ان کی کتاب چھپ کر آنے والی ہے ساتھ ہی انھوں نے کتاب پر تبصرہ لکھنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ میں تو اس اعزاز اور پذیرائی پر حیران رہ گئی کہ کہاں مجھ ایسا ناتجربہ کار اور اناڑی اور کہاں احمد ظہور صاحب کی تخلیقی پختگی کی حامل کتاب؟ کیا میرا اظہار رائے اس کتاب کا حق ادا کر سکے گا؟ اسی ادھیڑ بن میں وعدہ کر لیا..... دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ اللہ کرے میں اس وعدہ کو نبھا سکوں.....اور غیر محسوس انداز میں انتظار کی کیفیت میں رہنے لگی۔ آج جو کچھ بھی گوش گزار کر رہی ہوں محض ایک وعدے کی تکمیل ہے، لہٰذا اس تحریر کو کسی پیمانے پر پرکھے بغیر ہی قبولیت کا حقدار سمجھ لیجئے گا۔

غالباً نومبر ۲۰۱۳ کی شام تھی، ادارۂ اردو کی ایک محفل میں شرکت کے لیے گئی تو میز پر پڑی

آصفہ باجوہ

ہوئی کتابوں پر نظر پڑی، جن کے چہرے پر مسکراتا ہوا ٹائٹل "وہ کھڑکی اب بھی کھلتی ہے" اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ آج احمد ظہور صاحب کی کتاب کا ظہور ہو گا لیکن ابھی انتظار باقی تھا..... منتظمین نے بتایا کہ آج احمد ظہور صاحب کسی مصروفیت کی بنا پر نہیں آپائیں گے اور آئندہ کسی نشست میں وہ بنفسِ نفیس اپنی کتاب احباب کو دیں گے۔ سو انتظار اب بھی باقی تھا.....

گزرے دسمبر کے ابتدائی ہفتوں کی کسی تاریخ کو "نمل" میں ہونے والی ایک تقریب کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا، میں اپنی ایک دوست کے ہمراہ ہال کے ایک کونے میں کھڑی چائے پی رہی تھی کہ احمد ظہور صاحب باوقار اور دھیمے انداز میں چلتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد اپنی کتاب پر چند جملے لکھ کر میرے ہاتھ میں تھما دی اور ساتھ ہی یاد دہانی بھی کروا دی کہ آپ نے میری کتاب پر 'ری ویو' لکھنا ہے۔ میں نے فوراً اقرار کر لیا۔ حق تو ادا نہیں ہوا لیکن جتنی مری ہمت اور استعداد تھی، میں نے کوشش کی ہے۔

"وہ کھڑکی اب بھی کھلتی ہے" ہاتھ میں آئی تو فوراً جی چاہا کہ اسی نظم کو پڑھوں جو ظہور صاحب کی شخصیت اور شاعری کے تعارف کا باعث بنی اور اتفاق سے یہ نظم کا ٹائٹل بھی ہے۔ راولپنڈی سے اسلام آباد واپسی اور گھر پہنچنے کا انتظار بھی مشکل ہو رہا تھا۔ دورانِ سفر ہی میں نے موبائل فون کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتاب کے مندرجات پر نظر دوڑائی اور ورق گردانی کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں میری نظر بار بار جس لفظ سے ٹکرائی اور ٹھہری وہ تھا "گھر"۔

رات کو سونے سے پہلے کتاب کو کھولا اور حسبِ عادت کتاب کا آخری صفحہ کھولا اور ان اشعار پر نظر پڑی:

عمر بھر جو نہ ملے تھے کبھی اپنوں کی طرح
آج پیار کے سرھانے وہ رکھ آئے پھول

بعد مرنے کے تجھے کون بتائے گا ظہور
کس نے کس رنگ کے تھے قبر پر برسائے پھول

.....

پھر صفحہ در صفحہ کھولتی گئی اور جس صفحے پر بھی لفظ "گھر" نظر آتا اس کو نشان زدہ کر لیتی۔ پڑھتے ہوئے یہ احساس پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے کہ لکھنے والے نے پوری حساسیت اور صداقت سے زندگی کا نہ صرف مشاہدہ کیا ہے بلکہ لمحہ لمحہ تجربے کی بھٹی سے گزرا ہے۔ یوں تخیل سے حقیقت کا روپ دھارتے ہوئے الفاظ، حرف بحرف، اپنی تاثیر کی گواہی دیتے چلے جاتے ہیں۔

احمد ظہور صاحب نے نہ صرف زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا اور برتا ہے بلکہ بڑی دردمندی سے اس کے بیان کو اظہار کا پیرایہ بھی عطا کر دیا ہے۔

زندگی کے اجتماعی اور انفرادی سطحوں پر ایک

دردمند دل کے احساسات و جذبات، عمل اور ردِعمل کے جتنے ممکنات ہو سکتے ہیں اس کتاب کے مطالعے کے دوران محسوس کیے جا سکتے ہیں الفاظ کی گہرائی اور گیرائی میں کوئی شک نہیں ہے۔

وقت کی کمی مانع آ رہی ہے جس کے باعث صرف لفظ ''گھر'' سے جڑے ہوئے اشعار کو ہی سامنے لا رہی ہوں۔ یہ محض اشعار ہی نہیں ہیں بلکہ ظہور صاحب کی شخصیت کی گھر سے وابستہ ''گہری'' انسیت کے آئینہ دار بھی ہیں:

شور گھر گھر سے قیامت کا اٹھا میرے بعد
میں جو کہتا تھا، زمانے نے کہا میرے بعد

حرام ہے سبھی در و دیوار کی پامالی
پھر اپنے گھر کو بھلا کیوں نہ میں حرم لکھتا
(ص)۴۵

روشن شبِ فراق بھی ہے سارا گھر بہت
لو دے رہے شام سے داغ جگر بہت
(ص)۴۷

گھر بنایا ہے تو اس گھر کو سنبھالو خود ہی
اس کی گرتی ہوئی دیوار بچالو خود ہی
(ص)۵۴

اختلاف سوچ کی ایسی ملی مجھ کو سزا
رفتہ رفتہ اپنے گھر میں ہی تنہا ہو گیا
(ص)۶۲

جس موڑ پر آ کر نظر آتا تھا تیرا گھر
اس موڑ پر اب آ کے بدل جاتی ہیں راہیں

.....

اندر کی بدحالی باہر دیکھ سکا نہ کوئی
صحن کی اونچی دیواروں نے رکھ لی گھر کی لاج
(ص)۷۸

تیرے آنے سے میرے گھر کی دنیا
بہت ہی خوبصورت ہو گئی ہے
(ص)۱۰۱

مرا گھر بھی کبھی ہو جائے روشن
مزاروں پر چراغاں کر رہا ہوں
(ص)۱۰۳

بیٹی کی رخصتی پر ایک خوبصورت احساس کو یوں بیان کرتے ہیں:

نزدیک میرے وہ جورگِ جان کی طرح تھی
شاید وہ میرے گھر کسی مہمان کی طرح تھی

دلہن بنے بیٹھے ہوئے کیوں آج وہ بیٹی
دہلیز پر رکھے ہوئے سامان کی طرح تھی
(ص)۱۴۵

مندرجہ بالا اشعار میں لفظ ''گھر'' اپنے آپ سے جڑے ہوئے خیالات، جذبات اور احساسات کا ایک جہان ہے جس میں ہم سب بھی اپنے اپنے تجربات کو رواں دواں محسوس کرتے ہیں۔ امید ہے، اور دعا بھی ہے کہ احمد ظہور صاحب، تخلیق کو تسلسل کا روپ دے کر دردمند اور حساس دل رکھنے والوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

سعادت

شاعر کا کام اور منصب بہت بڑا ہے، یہ اپنے تخلیقی ہنر سے کائنات کے اندر اپنی الگ کائنات تشکیل دیتا ہے، اس کے در و دیوار تعمیر کرتا ہے، منظر در منظر سجاتا جاتا ہے اور پھر اسے یوں پینٹ کرتا ہے کہ ہر منظر میں اس کے مزاج کے مطابق رنگوں کی کھچڑی بکھیر دیتا ہے۔ شاعر کی اس تخلیقی کائنات کی سیر بھی وہی کر سکتا ہے جسے علم و فن اور شعر و سخن کا فہم عطا کیا گیا ہو اور وہ صاحب فہم و دانش لفظوں کے ذائقے اور ان سے تشکیل پانے والے مناظر تک رسائی کا اہل ہو۔

شاعر کا کام اس وقت مزید اہمیت و تقدس اختیار کر جاتا ہے جب وہ کائنات کی محبوب ترین ہستی سرورِ کائنات کی شخصیت و فضائل پر اپنے تخیل کے پر پھیلاتے ہوئے عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

وجہ تخلیق کائنات محمدؐ عربی کی تعریف کس قدر احسن عمل ہے کہ خود خالق کائنات اپنے محبوب نبیؐ کی تعریف فرماتا ہے، کہیں آپ کی زلفوں پر گفتگو کرتا ہے تو کہیں آپ کے چہرۂ پرانوار پر بات کرتا ہے، کہیں رب کائنات آپؐ کے موجود ہونے سے شہر مکہ کی گلیوں کی قسمیں اٹھا رہا ہوتا ہے تو کہیں خطا کاروں کو معافی و درگزر کے لیے ان کے حضور پیش ہونے کا حکم دے رہا ہوتا ہے اور کہیں خبردار کر رہا ہوتا ہے کہ اے نبی کے ماننے والو، اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے اونچا نہ ہونے دینا۔ آقائے کائنات کی تعریف و توصیف یقیناً ایک بہترین عمل ہے اور کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنے تخلیقی ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے آپؐ کے حضور عقیدت و محبت کے گلدستے پیش کر کے دشت سخن کو گل و گلزار کرنے میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ رب کائنات کی توفیق اور آپؐ کی نظر التفات کے بغیر ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ کبیر والا سے ہمارے بہترین شاعر دوست محسن رضا شافی صاحب انہی

محمد علی ایاز

چنیدہ لوگوں میں شامل ہیں جو دن رات اپنی نعتیہ شاعری کے ذریعے محبت رسولؐ کے پھول کھلانے میں مصروف عمل ہیں، ان کی شاعری سے نبی کریم اور اہلِ بیت اطہار سے محبت کے وہ جھرنے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے کر اس کے اندر لطف و فرحت کا احساس پیدا کرتے ہیں اور ایمانی جذبہ کو تر و تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ عشق و مستی کی حرارت بخشتے ہیں۔ محسن رضا شافی کے نعتیہ مجموعہ کلام کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں صرف روایتی عقیدت و محبت کا ہی عنصر نہیں بلکہ ان کے کچھ اشعار چونکا دینے والے بھی ہیں، مجھے یقین ہے کہ یہ خوش آئند سخن وری ان کے آئندہ منفرد اسلوب اور لب و لہجہ کی اساس بنے گی۔

آج جب شاعری قدیم و کلاسیکل دور سے گزرتی ہوئی جدید تقاضوں کے مطابق نئے نئے تجربات کے ذریعے منفرد اسالیب میں ڈھل کر سامنے آ رہی ہے تو میدانِ نعت میں بھی آج کا نعت گو شاعر نئے امکانات تلاش کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک نعتیہ شاعری جیسے ہے، جس طرح ہے کی بنیاد پر قابل قبول سمجھی جاتی ہے اور نعتیہ شاعری میں مزید بہتری اور امکانات تلاش کرنے اور اس پر گفتگو کرنے کو ناپسندیدہ عمل سمجھا جاتا تھا مگر آج ایسا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی جدید نعتیہ شاعری صرف عقیدت و محبت ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں تمام فنی محاسن، تغزل، تراکیب و استعاروں کا استعمال عام ملتا ہے۔ محسن رضا شافی صاحب کس قدر خوش قسمت ہے کہ روز حشر جب اسے نامہ اعمال دینے کے لیے پکارا جائے تو اس وقت اس کے ہاتھ میں بھی سعادت کے نام سے ایک مجموعہ عمل ہوگا جو یقیناً اس کی بخشش کے ساتھ ساتھ مزید اجر و نوازشات کا سبب بنے گا۔ آخر میں قارئین کے ذوق مطالعہ کے لیے محسن رضا شافی کی کتاب سعادت سے چند نعتیہ اشعار بطور حصول سعادت پیش کرتا ہوں:

دل میں نمو پذیر ہے ذکر نبی کی چاہ
جیسے شجر سے شاخ نئی پھوٹتی ہوئی

کھولی ہے کس نے آنکھ یہ صحن حیات میں
جشن طرب بپا ہوا دونوں جہان میں

یہ ہفت افلاک یہ عالم ترے ہونے کا صدقہ ہیں
وگرنہ ارتقائے کن فکاں بھی نامکمل ہے

پھر یوں ہوا کہ رشک فصاحت ہوئے بلال
اذن اذاں سے ہو گئی لکنت تمام شد

ہم اہل بیت کو بھی نعت میں شامل سمجھتے ہیں.
جو ذکر مصطفیٰ میں بھی برابر یاد آتے ہیں

پہلے تو باغ عشق سے مدحت کے پھول چن
پھر اس کے بعد بیٹھ کر نعت رسول بن

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔
مصطفیٰ زیدی نے کہا ”افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا اڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔
شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلک کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔
ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

اس وقت جی او سی میجر جنرل صلاح الدین ترمذی تھے۔ جنرل صاحب پیشہ ورانہ طور پر تو پکے فوجی تھے لیکن طبعًا ان کا شمار Happy Go lucky type افسروں میں ہوتا ہے۔ دوست احباب پیار سے انہیں کھلنڈرا جرنیل بھی کہتے تھے۔ شام کو بوسکی کی قمیض پہنے گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے جب اپنی مرسیڈیز پر سیر کے لئے نکلتے تو ہر نگاہ ان پر پڑتی۔ ان کا تعلق کاغان سے تھا۔ خاصا متمول زمیندار گھرانہ تھا۔ انہوں نے نوکری تو ڈٹ کر کی لیکن کبھی

اسے پاؤں کی زنجیر نہ بننے دیا۔ صاحب دل تھے، دل والوں کی طرح گھومتے پھرتے۔ اکثر افسر ڈر ڈر کر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں مبادا ان کی رپورٹ نہ ہو جائے۔ انہوں نے سروس کی کشتی خدا پر چھوڑ رکھی تھی اور کبھی حالات کی تندو سرکش موجوں سے نہ گھبرائے۔ بایں ہمہ ان کی کشتی صحیح سلامت کنارے پر وقت مقررہ پر آن لگی۔ یہ بعد میں ملتان کے کور کمانڈر بھی رہے۔ ہو سکتا ہے جنرل پرویز مشرف کو ان کا رہن سہن دیکھ کر اپنا ماضی یاد آ گیا ہو۔ جذباتی ضرور تھے لیکن خلوص کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ احباب میں خاصے مقبول تھے کیونکہ دوستی کرنا اور پھر اسے نبھانا بھی جانتے تھے۔

الیکشن ۹۰ء: بے نظیر کے خلاف جب عدم اعتماد کی تحریک ناکام ہوئی تو شہباز شریف کی گھبراہٹ دیکھ کر میں نے انہیں تسلی دی تھی۔ This may be a blessing in disguise ہو سکتا ہے میاں صاحب کو یہ لفظ بڑے عجیب اور مہمل لگے ہوں لیکن پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ میری پیشین گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ بے نظیر کی ناتجربہ کاری اور زرداری کی متلون مزاجی نے مقتدر حلقوں کو خاصا برا فروختہ کر دیا تھا۔ راجیو گاندھی کو خوش کرنے کے لئے اس کی اسلام آباد آمد پر آزادی کشمیر سے متعلق جتنے بورڈ آویزاں تھے سب اُتروا لئے گئے

''عام طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ اسلامی جمہوری اتحاد آپ کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ان پارٹیوں کو یکجا کرنے میں آپ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں؟''

بولے ''میں نے جو کچھ کرنا تھا کر دیا ہے۔ اب میرا کوئی رول نہیں ہے۔''

صدر غلام اسحاق خان نے بالآخر وہ کر دیا جس کے لئے اسے قصر صدارت میں لایا گیا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو ہر آمر کے دور میں پھلا پھولا اور ترقی کے زینے پر بتدریج چڑھتا گیا۔ اس نے اپنی سروس کا آغاز تحصیلداری سے کیا لیکن آہستہ آہستہ اُس کی صلاحیتوں کے جوہر آشکار ہوتے گئے۔ بھٹو دور میں وہ فیڈرل سیکرٹری تھا۔ جب ضیاالحق آیا تو اس نے خان صاحب کے لئے ایک مضحکہ خیز لیکن اہم پوسٹ Create کی۔ سیکرٹری جنرل انچیف۔ اس قسم کا Nomeclatur برصغیر میں نہیں تھا لیکن ایک آمر کچھ بھی کر سکتا تھا جو شخص آئین بارہ صفحوں کا کتابچہ

سمجھتا ہوا سے ان باتوں کی بھلا کیا پروا ہو سکتی تھی۔ یہ تو محض ابتدا تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سینٹ کا چیئرمین بن گیا۔ جب ضیا الحق کے جہاز کو حادثہ پیش آیا تو اسے عبوری صدر بنا دیا گیا۔ بے نظیر حکومت آئی تو محترمہ کی مدد سے وہ صدارت کے عہدے پر جا پہنچا۔ جب ایک دفعہ اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تو جمہوری حکومت کو آنکھیں دکھانی شروع کر دیں۔ آئین کی دفعہ 58.2B جس کے تحت صدر وزیراعظم کو ہٹا سکتا تھا اور پارلیمنٹ کو ڈسمس کر سکتا تھا ضیا الحق نے اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اسی کے تحت جونیجو فارغ ہوا۔ وہی بے نظیر کے خلاف دو دفعہ استعمال ہوئی اور اسی کا نشانہ میاں نواز شریف بھی بنا۔

درویش وزیراعلیٰ: چونکہ میاں صاحب کی ''پروموشن'' ہونی تھی اس لئے انہوں نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت چیف منسٹری چھوڑ دی اور میاں چنوں کے ایک پارٹی ورکر غلام حیدر وائیں کو عبوری وزیراعلیٰ بنا دیا گیا۔ میاں صاحب نے بڑا سوچ سمجھ کر وائیں صاحب کا نام تجویز کیا تھا۔ وائیں کٹر مسلم لیگی تھا، غریب آدمی تھا، اس کا ماضی داغدار نہ تھا اور نواز شریف اس سے کسی قسم کا خطرہ بھی محسوس نہ کرتا تھا۔ اس وقت تک ان کے برادر خورد شہباز شریف کی صلاحیتوں کے جوہر بھی نہ کھلے تھے اور وہ پارٹی میں کوئی خاص مقام بھی نہ بنا پایا تھا۔ چونکہ یہ عبوری انتظام تھا اور ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی تھی اس لئے کسی نے اعتراض نہ کیا۔

غلام حیدر وائیں تقسیم کے وقت ہجرت کر کے پاکستان آیا۔ اس کا کل اثاثہ ایک ٹرنک تھا جس میں کپڑے کم اور نوائے وقت اخبار کی کاپیاں زیادہ تھیں۔ میاں چنوں آ کر اسے تلاش معاش کا مسئلہ پیش آیا اور وہ بودلوں کے پاس منشی بھرتی ہو گیا۔ چونکہ سیاست کے جراثیم تو تھے ہی، اس نے عملی سیاست کا آغاز ٹاؤن کمیٹی کی ممبری سے کیا۔ اس وقت تک بودلوں اور قریشیوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دن یہ مسکین صورت انسان ان کے سیاسی کان کاٹے گا اور ان کی لن ترانیوں کی لنکا ڈھا دے گا۔ سیاسی جلسے جلوسوں میں جب بھی پولیس کو پھینٹی لگانے کی ضرورت پیش آتی تو اس کا نزلہ عضو ضعیف پر گرتا اور سب سے پہلے وائیں صاحب پولیس تشدد کا نشانہ

بنتے۔ باقی لوگ تو دوڑ جاتے یہ اپنی سادگی کی وجہ سے وہیں کھڑے رہتے۔ شاید دوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

لاولد تھے۔ اپنا کوئی مکان نہ تھا۔ اُن کی سالی نے میاں بیوی کو ایک چھوٹا سا کمرہ دے رکھا تھا۔ وہیں ان کی سب کائنات محفوظ تھی۔ جب وزیراعلیٰ بنے تو مہمانوں کو بٹھانے کے لئے ان کے پاس کوئی ڈرائنگ روم نہ تھا۔ بیڈ روم بھی کمیٹی کی گندلی نالی پر بنا ہوا تھا۔ پہلے تو یہ باہر سے آئے ہوئے مہمان کو ملتے ہی نہ تھے۔ باامر مجبوری ملاقات کرنا ہی پڑتی تو مسلم لیگ کے دفتر میں ملتے۔ اگر کسی کو چائے کی پیالی پلا دیتے تو وہ اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا۔ عیدین پر جب ضلعی اور ڈویژنل انتظامیہ انہیں عید مبارک کہنے جاتی تو میاں چنوں کی مشہور برفی سے اُس کی خاطر تواضع کرتے۔ پارٹی ورکر اور سائلوں کو اُن سے ملنے کی ضرورت اس لئے پیش نہ آتی کہ وہ خود ہی ان کے پاس پہنچ جاتے۔ ہفتے میں دو دن اپنے حلقے کے لئے مختص کر رکھے تھے۔ آندھی ہو یا برسات، گرمی ہو یا سردی یہ ان تک ضرور پہنچتے۔ پراٹوکول کا کبھی خیال نہ کیا۔

وائیں صاحب میٹرک پاس تھے۔ گو انگریزی میں بھی شد بد تھی کیونکہ بھلے وقتوں کے پڑھے ہوئے تھے لیکن قومی زبان کے داعی تھے۔ انھوں نے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے تمام محکموں کو اُردو میں سمریاں بھیجنے کا پابند کر دیا۔ اس پر کالے انگریز بڑے جز بز ہوئے۔ ایک سیکرٹری کہنے لگے ''آخر یہ چاہتا کیا ہے؟ کیا ہم از سر نو سکول میں داخل ہو کر یہ گھسی پٹی زبان سیکھیں۔ ہر سیکرٹری نے اپنے دفتر میں ایک عدد اُردو ڈکشنری اور دو منشی مقفے رکھے ہوئے تھے جو انگریزی الفاظ کو مناسب اُردو کے قالب میں ڈھالتے۔ ایک دوسرے کو فون کر کے اُردو الفاظ کے معانی اور مفاہیم دریافت کرتے اور دوران گفتگو وائیں صاحب کو بے نقط سناتے۔ انھوں نے مشہور کر دیا کہ پنجاب میں ان پڑھ وزیراعلیٰ کو تعینات کیا گیا ہے۔ اس مرد درویش پر ان پھبتیوں اور اپیلوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور جتنا عرصہ وہ چیف منسٹر رہا کاروبار حکومت اُردو میں ہی چلتا رہا۔

دریا نہ ویندے ہک منڑیں: جہاں تک سیاسی داؤ پیچ کا تعلق تھا وائیں پہلے امتحان میں ہی پاس ہو گیا۔ شجاع آباد تحصیل

سے جاوید علی شاہ اور دیوان عاشق ممبر تھے۔ دونوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر رکھی تھی۔ وائیں نے انہیں توڑ لیا۔ اس سلسلے میں حامد رضا گیلانی کی خدمات سے استفادہ کیا گیا۔ وائیں ان کی بہت عزت کرتا تھا۔

طے یہ پایا کہ وائیں صاحب جاوید شاہ اور دیوان عاشق کے ڈیرے پر جا کر انہیں ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' کی باضابطہ دعوت دیں گے اور وہ ازراہ مہمان نوازی دعوت قبول کر لیں گے کیونکہ سادات گھر آئے ہوئے مہمان کا دل نہیں توڑتے اور پھر جلال پور پیر والا میں عوامی جلسہ ہوگا جس میں وہ ''پینترا'' بدلنے کا رسمی اعلان کریں گے۔

جب ضلعی پیپلز پارٹی تک یہ خبر پہنچی تو کھلبلی مچ گئی۔ بے نظیر نے یوسف رضا کو لتاڑا کہ وہ کیسا علاقائی لیڈر ہے جس کے اپنے چراغ تلے اندھیرا ہو گیا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا جاوید شاہ کے پاس گیا۔ جس قدر منت سماجت کر سکتا تھا، کر ڈالی لیکن جاوید شاہ ٹس سے مس نہ ہوا - وہ میدان سیاست کے شہسوار فخر الدین شاہ کا بیٹا تھا جسے بروقت پتہ چل جاتا کہ راہوار سیاست کس سمت کو دوڑ رہا ہے اور کون سے کھلے پر جا کر اس نے راتب کھانا ہے۔

میری جاوید علی شاہ سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ مجھے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ ہزاروں کے مجمعے میں کھڑے ہو کر وہ اچانک وفاداریاں بدلنے کا کیا جواز پیش کرے گا۔

وائیں جلوس کی شکل میں شجاع آباد گیا۔ وہاں جاوید شاہ کو لے کر جلال پور پیر والا پہنچا۔ جلسہ شروع ہوا۔ تلاوت اور نعت خوانی کے بعد پہلی تقریر جاوید شاہ نے کی۔

کہنے لگا ''خواجہ فرید اس دھرتی کا بہت بڑا صوفی شاعر تھا۔ وہ کافی عرصہ پہلے کہہ گیا تھا:

دریا نہ ویندے ہک منڑیں
کدی ہس منڑیں، کدی ہُس منڑیں

.....

''دریا آزاد ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایک سمت میں ہی نہیں بہتے۔ کبھی ادھر کا رُخ کر لیتے ہیں تو کبھی اُدھر کا۔''

''اساں دریا ہاں'' شاہ صاحب گرجے ''اساں خواجہ فرید دے پیروکار ہاں۔ اساں ہن ہس منڑیں ویڑا شروع کر دتا اے'' انھوں نے اُنگلی سے غلام حیدر وائیں کی طرف اشارہ کیا - تالیوں کے شور سے میدان گونج اُٹھا۔ دیوان عاشق کمزور مقرر

تھا۔ صرف یہ کہہ کر بیٹھ گیا کہ میں جاوید شاہ سے اتفاق کرتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کرتا ہوں۔

وائیں صاحب کی تقریر خاصی طویل تھی۔ انھوں نے ہر دو کو پارٹی میں شمولیت پر نہ صرف خوش آمدید کہا۔ بلکہ یہ نوید مسرت بھی سنائی کہ عنقریب ہی پنجاب کے سب بھولے بھٹکے مسافر اپنے اصل گھر لوٹ آئیں گے۔ کیونکہ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے ہیں۔ تین بجے صبح جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ مرزا محمد علی اور میں وائیں کے ساتھ تھے۔ ہم پانچ بجے کے قریب ملتان پہنچے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ سرکٹ ہاؤس میں کچھ دیر آرام کرے گا لیکن وہ سیدھا میاں چنوں چلا گیا۔ اسے وہاں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت پارٹی ورکرز سے خطاب کرنا تھا۔ میں نے کہا آپ تھک گئے ہیں تھوڑا سا آرام کر لیں۔ بولا ایک دفعہ آدمی سو جائے تو پھر خواب غفلت سے بیدار ہونے میں وقت لگ جاتا ہے۔ مجھے صرف ایک تکیہ منگوا دو۔ میں گاڑی میں ہی گھنٹہ دو گھنٹے ٹانگیں سیدھی کر لوں گا۔

اسی شام وہ واپس سرکٹ ہاؤس آ گئے۔ پارٹی ورکرز اور ٹکٹ حاصل کرنے والوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ ان سے رات گئے باتیں کرتے رہے۔ نصف شب کے قریب مجھے بلایا اور کہنے لگے رات دو بجے میں نے لیبر لیڈر ظہیر تاج سے ملاقات کرنی ہے۔ بہت موثر لیڈر ہے۔ اگر ہمارا ساتھ دے تو ملتان میں الیکشن جیتنے میں خاصی سہولت رہے گی۔ میں اسے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں اس لئے سرکٹ ہاؤس میں تمھارے علاوہ اور کوئی شخص نہ ہو۔ چاہو تو ایس پی کو بھی چھٹی دے دو۔ ہاں البتہ کچھ سوچتے ہوئے بولے ''چائے وائے کا بندوبست ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں دل میں ہنسا کہ چلو کوئی شخص تو ہے جس کو وائیں صاحب چائے پلانے کا باقاعدہ اہتمام کر رہے ہیں۔

ظہیر تاج ٹھیک وقت پر پہنچا۔ اس کے ساتھ چند دیگر لیبر لیڈر بھی تھے۔ صبح پانچ بجے تک باتیں ہوتی رہیں وائیں صاحب نے دعائے خیر کے بعد انہیں رُخصت کیا۔

ادھر وائیں صاحب جنوبی پنجاب کے اہم برج گرا رہے تھے تو اُدھر میاں صاحب عوامی سیلاب کے ساتھ ملک کے طوفانی دورے کر رہے تھے۔ بے نظیر کی حکومت کا گرنا اس بات کی دلیل تھی کہ اب کے میاں نواز شریف کی باری ہے۔ مرغانِ باد نما نے

فوراً اپنا سیاسی قبلہ تبدیل کر لیا۔ وہ لوگ جو عموماً آخر وقت تک جنگلے پر بیٹھ کر حساب لگاتے رہتے ہیں کہ کس کا پلڑا بھاری ہے اور کس وقت کدھر کودنا ہے، انہوں نے بھی چھلانگیں لگا دیں۔ بعض تو سر کے بل آن گرے۔ اسی طرح تاجر برادری نے بھی اپنے بٹوؤں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ میاں صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ ملتان ڈویژن کے صنعت کاروں اور متمول تاجروں کی لسٹ تیار کی جائے اور انہیں ماڈل ٹاؤن لاکران سے ملاقات کرائی جائے۔ اتنی بڑی پارٹی مشین کو چلانے کے لئے فنڈز کی ضرورت تھی۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ میاں برادران اپنی جیب پر انحصار کم ہی کرتے ہیں۔

میں گروپس کی شکل میں انہیں ماڈل ٹاؤن لے جاتا جہاں میاں صاحب اُن سے فرداً فرداً ملاقات کرتے۔ ملاقات سے پہلے مجھ سے صرف اتنا پوچھ لیتے کہ اس کی مالی حیثیت کتنی ہے۔ اسی حساب سے چندہ مانگتے۔ اگر کوئی بڑی پارٹی ہوتی تو اُس کی انار کے جوس سے تواضع کی جاتی نہیں تو لسی کے گلاس پر ہی ٹرخا دیا جاتا۔ مدعومین کی اکثریت نے ان سے مالی تعاون کیا۔

سب کو یقین ہو چلا تھا کہ میاں صاحب ہی مستقبل کے وزیراعظم ہیں - ایک کارخانہ دار کو وزیراعظم کے اختیارات کا پتہ ہوتا ہے اور خیر سے وزیراعظم بھی ایسا جو ان میں سے ایک تھا اور ان کی کمزوریوں، خامیوں اور عیبوں سے بخوبی واقف تھا۔ ایک تاجر کے لئے تو انکم ٹیکس افسر کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے ایف آئی اے تو بہت بڑی چیز ہے - اس مالی ڈرامے میں صرف ایک مرتبہ دلچسپ صورت پیدا ہوئی۔ کالونی ٹیکسٹائل ملز پاکستان کی قدیم ترین ملوں میں سے ایک ہے۔ اس کا مالک مغیث اے شیخ اپنی تھڑ دلی اور کنجوسی کے لئے سارے ملک میں مشہور تھا۔ اسے جب میاں صاحب نے بیس لاکھ روپے چندے کے لئے کہا تو وہ گھگھیانے لگا۔ عملاً رو پڑا۔

کہنے لگا ''مل کا تو بس نام ہی رہ گیا ہے ہر سال نقصان کر رہی ہے کچھ خبر نہیں کتنے دن یہ سفید پوشی چلے گی۔ اوّل تو میں کچھ دینے کے قابل نہیں ہوں لیکن اگر مجبور کرتے ہیں تو پانچ لاکھ حاضر ہیں۔ مجبور اور پانچ لاکھ کے لفظ میاں صاحب کے لئے تازیانہ بن کر گرے۔ غصے سے سرخ و سفید رنگ کچھ

مزید سرخ ہوگیا۔ اس سے تو کچھ نہ کہا مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے ''شاہ صاحب Take care of him'' وہ بید مجنوں کی شاخ کی طرح تھر تھر کانپنے لگا اور میاں صاحب غصے میں اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ وہ میرے گھٹنوں سے لپٹ گیا۔ ''مجھے بچاؤ!'' بڑی مشکل سے میں نے اسے معافی دلوائی۔ بے شک مانا ہوا شوم تھا لیکن شریف بھی تھا۔

الیکشن کا موسم بڑا ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ نئی صف بندیاں ہوتی ہیں۔ جوڑ توڑ عروج پر ہوتا ہے۔ ٹکٹ لینے والوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں - سفارشیں، منت سماجت اور دھمکیاں، بھٹو (مرحوم) نے پہلا الیکشن تو عوامی مقبولیت کے زور پر جیتا تھا۔ اس وقت اشرافیہ کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس قدر حیرت انگیز کامیابی حاصل کریں گے۔ کھمبے کو ٹکٹ ملا تو کھمبا ممبر منتخب ہوگیا۔ گدھے کو پرچی ملی تو اُس کے گلے میں پھولوں کا ہار پڑ گیا۔ دوسری دفعہ انہیں احساس ہوا کہ بے شمار ناپسندیدہ، ان پڑھ اور بری شہرت رکھنے والے لوگ بھی منتخب ہوگئے ہیں۔ چنانچہ تمام ڈپٹی کمشنروں اور ایجنسیوں کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ متوقع اُمیدواروں کا ڈیٹا اکٹھا کریں۔ مقصد یہ تھا کہ صرف ان لوگوں کو ٹکٹ دیا جائے جن کا اپنا کوئی وزن اور قد کاٹھ ہو۔

اس کے بعد ہر حکومت کا یہ طریقہ کار بن گیا تھا کہ متوقع اُمیدواروں کی رپورٹ ضرور منگواتی۔ مقصد اتنا کردار کی جانچ پرکھ نہیں تھا جتنا یہ جاننا کہ اس کے جیتنے کے امکانات کس قدر ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے بل بوتے پر الیکشن لڑتے ہیں۔ پندرہ بیس فیصد پارٹی سپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی بھی پارٹی سے مل سکتی ہے کیونکہ اس قسم کے لوگوں کو ہر پارٹی ٹکٹ دینے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ چھوٹے موٹے اُمیدواروں کو کچھ وعدے وعید کر کے بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہ ازخود تو نہیں جیت سکتے لیکن ان کی موجودگی زچ کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔

اکثر اُمیدوار تو منطقی ہوتے ہیں یعنی ہر کسی کو پتہ ہوتا ہے کہ ان کو ٹکٹ ملنی ہی ملنی ہے۔ البتہ معدودے چند سیٹوں پر رسہ کشی ہوتی ہے۔ ملتان سے صدیق خان کانجو، حامد رضا گیلانی، جاوید ہاشمی، جاوید علی شاہ، وغیرہ تو منطقی اُمیدوار تھے البتہ دو سیٹوں پر خاصی

تلخی ہوئی۔ ایک تو شہر سے حامد رضا کے بھتیجے تنویر گیلانی کی سیٹ تھی۔ اس سے پہلے شیخ رشید منتخب ہوتا تھا۔ حامد رضا گیلانی نے جاوید شاہ اور دیوان عاشق کو مسلم لیگ میں لانے کے لئے جو کردار ادا کیا تھا اُس کی قیمت اس طرح ادا کی گئی کہ ایک پرانے وفادار کو نظر انداز کر کے تنویر کو ٹکٹ دیا گیا۔ اس پر شیخ رشید پارٹی میٹنگ میں پھٹ پڑا۔ جب وہ غصے میں ہوتا تو دائیں ہاتھ کی پہلی دو اُنگلیوں کو V کے انداز میں کھڑا کر کے جو کچھ منہ میں آتا کہہ دیتا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میاں صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگا ''او نواز! تو پچھتائیں گا'' اس نے واپس آ کر الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ صدیق خان کانجو بھی میاں صاحب کے بہت قریب تھا۔ یہ لالیکا، شیخ رشید، چوہدری نثار اور ملک نعیم پنج پیارے کہلاتے تھے۔ کانجو اپنی پھرتیوں کی وجہ سے علاقے میں خاصا غیر مقبول ہو گیا تھا۔ اس کا مقابلہ پیپلز پارٹی کے مرزا ناصر بیگ سے تھا۔ اس کی پوزیشن اس وقت خاصی کمزور ہو گئی جب پیر نصر الدین شاہ نے بھی آزاد اُمیدوار کے طور پر الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ اس نے میاں صاحب کو بتا دیا کہ ان حالات میں اس کا الیکشن جیتنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ تیسرا مسئلہ مولانا حامد سعید کاظمی کا تھا۔ اس کا تعلق جے یو پی سے تھا۔ تھا تو مولانا لیکن غالب و میر کے جو من جملہ مشاغل تھے اُن کا تھوڑا بہت مزہ یہ بھی چکھ لیتے۔ ان کا اتنا وقت نماز روزے میں نہ گزرتا جتنا ٹائم داڑھی کی تراش خراش آنکھوں میں کاجل ڈالنے، گلوریاں بنانے اور کھانے میں لگ جاتا۔ وائیں اسے ہر حال میں ٹکٹ دینا چاہتا تھا لیکن کسی وجہ سے خود کھل کر بات نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بلا کر کہا شاہ صاحب اس کا کیس آپ نے پلیڈ کرنا ہے۔

میاں صاحب نے گورنر ہاؤس میں میٹنگ کی جس میں پنجاب کی تمام انتظامیہ کو بلایا گیا۔ صبح سے لے کر رات گئے تک میٹنگ جاری رہی۔ جب ملتان کی باری آئی تو میاں صاحب مصر ہوئے کہ حامد سعید کاظمی کو صرف اس صورت میں ٹکٹ دیا جائے گا اگر وہ جمعیت علمائے پاکستان چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لے۔ وائیں نے بے بسی سے کندھے اُچکائے اور میری طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا۔

[جاری ہے۔]

غزل

یہ سفر، سَر بہ سَر رائیگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

کیا کہیں اہلِ غم، جھیلے کتنے ستم
کیا بتائیں کہ تابِ بیاں بھی نہیں

کچھ تو کہہ، کیا ہوا، اے ہوائے الم
دُور تک تار سا بادباں بھی نہیں

چشمِ نم جن پہ تھے اہلِ دل، اہلِ غم
آج ان بستیوں کے نشاں بھی نہیں

آگ تاپی عجب، عمر بھر، بے طلب
جل بجھے، اور اُٹھا دھواں بھی نہیں

سر چھپائیں کہاں بندگانِ گماں
ان سروں پر تو اب آسماں بھی نہیں

عدل چاہا، مگر ایک سچ بھول کر
بن ہلے، گونجتی گھنٹیاں بھی نہیں

رات کر دی سَحر، دَر بہ دَر گونج کر
دَر کشا، اس جگہ سسکیاں بھی نہیں

اے مرے عہد کی بے ہنر مفلسی
دوستوں کے لیے نقدِ جاں بھی نہیں

دیمکوں کے ہدف، کیوں نہ ہوں صف بہ صف
ہر ورق ایک سطرِ تپاں بھی نہیں

کون دیوان خالد پڑھے گا یہاں
ہم نوا کیا، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

خالد احمد

غزل

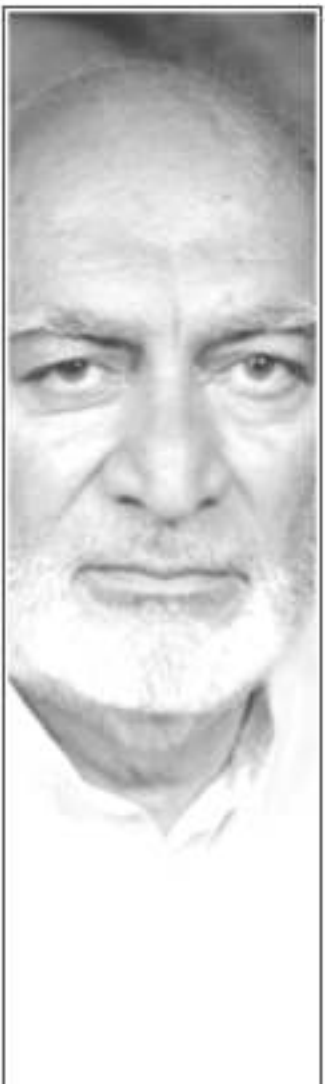

قرار و شوق کے رستے سے ہٹ نہ جائیں کہیں
چلے ہیں تیز مسافر، پلٹ نہ جائیں کہیں

ہمارے سامنے دنیا کی بانہیں پھیلی ہیں
ہم اپنے آپ میں لیکن سمٹ نہ جائیں کہیں

رکھے تھے میز پہ کاغذ کلام لکھنے کو
یہ خوف ہے کہ دواتیں الٹ نہ جائیں کہیں

چلے تھے وصل کے پھولوں کی جستجو میں ہم
بدن سے ہجر کے کانٹے لپٹ نہ جائیں کہیں

بڑے زمانے سے حسرت رہی ہے اس دل میں
ہمارے لوگ شریکوں میں بٹ نہ جائیں کہیں

ہمارے باغ کے پیڑوں پہ صبر کے پھل ہیں
نظر میں رکھیں گے ان کو یہ کٹ نہ جائیں کہیں

ہمیں تو چاند سے منظر کی آس ہے ثاقب
یہی گمان ہے آنکھیں پلٹ نہ جائیں کہیں

آصف ثاقب

غزل

ایسا سوچیں بھی تو سارے میں اُداسی ہو جائے
شہر کا کیا ہو جو انصاف سیاسی ہو جائے

جب بھی وہ جانِ نوا یاد سرا میں آئے
محفلِ دل کی فضا شام چوراسی ہو جائے

اُس کے جاتے ہی بدل جائیں سمے کے تیور
ایک اک ساعتِ جاں ہم کو بلاسی ہو جائے

یا تو نکلے کوئی اُس مہ کی طرف روزنِ دید
یا پھر اِس محبسِ ہجراں سے خلاصی ہو جائے

کچھ تو ہو گی کمی انسان کے وحشی پن میں
چھوڑ کر شہر، بیاباں کا جو باسی ہو جائے

منتظر ہے سرِ احساس جو اک سوچ سوال
اِس طرف بھی نظر اک بار ذرا سی ہو جائے

کوئی تعزیر لگاتی نہیں فطرت، جب تک
آدمی اپنی نگاہوں میں نہ عاصی ہو جائے

بھوک سے سانس اکھڑنے لگے خلقت کا تو پھر
کیوں نہ اک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو جائے

جینا مرنا ہو برابر جہاں عالی اُس جا
ذہن یاسی نہ ہو کیوں دل نہ ہراسی ہو جائے

جلیل عالی

غزل

جو دل زدہ ہیں کہاں اپنے زخم سیتے ہیں
غموں کا زہر بھی وہ مسکرا کے پیتے ہیں

لگایا دل نہ کہیں ہم سے بے نواؤں نے
رہِ سفر میں ہمیں ماہ و سال بیتے ہیں

عدو نے جیت کے مانا کہ ہار اس کی ہوئی
مگر یہ بات کہ ہم ہار کر بھی جیتے ہیں

عجب ہے ظرفِ محبت یہ کوئی کیا جانے
کہ تشنگی میں بھی آنسو خوشی سے پیتے ہیں

ہمارا حال بھی ماضی سے مختلف تو نہیں
بُرے زمانے بھی دیکھے جو، ہم پہ بیتے ہیں

بلا کے حوصلے دیکھے ہیں فاقہ مستوں میں
ہزار یورشِ غم ہو مگر وہ جیتے ہیں

ملے نہ طعنۂ اغیار اس لیے بھی حسن
کہ لوگ دامنِ صد چاک یوں بھی سیتے ہیں

حسن عسکری کاظمی

غزل

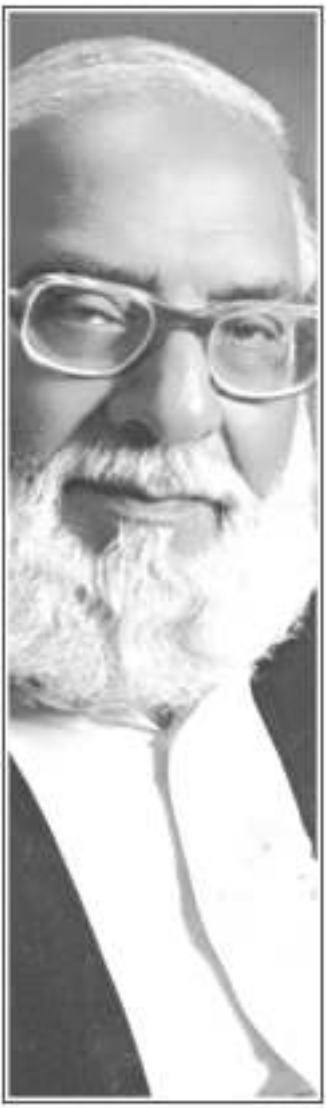

راستے تیرگی سے کٹ جائیں
راہِ روشن پہ لوگ ڈٹ جائیں

من کی دنیا میں روشنی کر دیں
تن کثافت سے جب کہ اٹ جائیں

آ رہی ہے بہار جاں افزا
سائے فصلِ خزاں کے چھٹ جائیں

جانے منزل پہ کون پہنچے گا
ہم اگر راستوں میں بٹ جائیں

ہے یہ اعجاز، زورِ ایقاں کا
اک اشارے سے بحر پھٹ جائیں

جراتوں کو جو ہم عناں کر لیں
کھائیاں ظلم کی بھی پٹ جائیں

آ گیا ہے ریاض جوبن پر
بے ہنر راستے سے ہٹ جائیں

سید ریاض حسین زیدی

غزل

دنیا مگن ہے فکرِ عروج و زوال میں
اور مَیں کہ گم ہوں اپنی ہی موجِ خیال میں

یہ شے تو بے حدود ہے اور لازمان ہے
کرتے ہو قید وقت کو کیوں ماہ و سال میں؟

شاید یہ رمز تیری سمجھ میں نہ آ سکے
مَیں کس کو ڈھونڈتا ہوں ترے خط و خال میں

میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں کیسا اکیلا پن !
شامل کوئی خوشی میں ، نہ کوئی ملال میں

مجھ کو طلب کہاں کسی ڈھولک کی تھاپ کی
مَیں مست ہوں خود اپنے لہو کی دھمال میں

اکثر مَیں کانپ اٹھتا ہوں یہ سوچ کر، کہیں
''جینا پڑے نہ پھر سے انہی ماہ و سال میں''

کچھ اس طرح سے کاٹ رہے ہیں یہ زندگی
پکڑے گئے ہوں جیسے کہ ہم یرغمال میں

جانِ غزل کی آنکھوں میں دیکھی ہے جو نسیمؔ
وحشت کہاں وہ دیکھی ہے چشمِ غزال میں

نسیمِ سحر

غزل

تمھیں نہ آئے گا اس بات پر یقین کبھی
کہ آسمان بھی ہوتا تھا اک زمین کبھی

لگے کہ اب بھی وہ موجود ہیں پسِ پردہ
مکان یوں تو نہیں چھوڑتے مکین کبھی

میں بچ گیا ہوں اسے کہنا اپنی خیر منا
تجھے ملے وہ اگر مارِ آستین کبھی

یہ اس کا در ہے جو سر کو جھکانے والوں کی
کہیں پہ جھکنے نہیں دیتا پھر جبین کبھی

میں دور کرتا چلوں آپ کی غلط فہمی
کسی بھی ایک کے ہوتے نہیں حسین کبھی

تمام عمر سمیٹی ہیں کرچیاں اس کی
کسی کا ٹوٹے نہ میری طرح یقین کبھی

ملے گا دھوپ میں سایہ تو برشگال میں چھت
مری سنے گا دعا رب عالمین کبھی

قریب لگتا ہے راحت وہ دور ہوتے ہوئے
ہٹا کے دیکھو تو آنکھوں سے دور بین کبھی

راحت سرحدی

غزلیں

کبھی مَیں تھا پر اَب ان بام و در میں اور ہے کوئی
یہ گھر میرا تھا لیکن آج گھر میں اور ہے کوئی

حویلی بھی وہی ہے رہنے والے بھی وہی لیکن
تماشا اَب کے ان دیوار و در میں اور ہے کوئی

مجھے دل سے یہ شکوہ: کیوں مری آنکھوں کا دشمن ہے
مگر دل کو گلہ، میری نظر میں اور ہے کوئی

پرندے کی اُڑانوں میں نمایاں فرق لگتا ہے
کہ جیسے اب کے جذبہ مشتِ پَر میں اور ہے کوئی

مری تسبیح کے دانوں میں کوئی اور رہتا ہے
تمنائے زمین و مال و زر میں اور ہے کوئی

خاور اعجاز

در و دیوار بستی کے سنہرے ہو گئے ہیں
مگر کچھ زخم تھے جو اور گہرے ہو گئے ہیں

بڑھاپے میں جواں اولاد طعنے مارتی تھی
چلو اچھا ہُوا ہم لوگ بہرے ہو گئے ہیں

یہاں تو لوگ بھی اِتنے نہیں رہتے ہیں شاید
کہ جتنے شہر کی گلیوں میں پہرے ہو گئے ہیں

یہ کیسی یک رُخی سی آ گئی ہے شاعری میں
مضامینِ غزل تک بھی اکہرے ہو گئے ہیں

ہر اِک چوپال اَب جرگہ نظر آنے لگی ہے
دیارِ دوستاں سارے کٹہرے ہو گئے ہیں

غزل

اِن لال آندھیوں میں شجر ٹوٹ جائیں گے
تم لوٹ کر نہ آئے تو گھر ٹوٹ جائیں گے

پاگل ہوا کا کچھ بھی نہ بگڑے گا پنچھیو
اِس جنگ میں تمھارے ہی پَر ٹوٹ جائیں گے

ہر شخص دیکھتا ہے ، مگر بولتا نہیں
بولا، تو جیسے کانچ کے گھر ٹوٹ جائیں گے

کچھ دوست ابتدائے سفر ہی میں کٹ گئے
کچھ اور درمیانِ سفر ٹوٹ جائیں گے

مہنگائی مجھ سے چھین رہی ہے متاعِ فن
لگتا ہے، اب کے دستِ ہُنر ٹوٹ جائیں گے

اِس خوف کا شکار ہیں ہم سَر برہنہ لوگ
دستار سر پہ رکھّی تو سَر ٹوٹ جائیں گے

اک شانِ فاتحانہ لیے سطحِ آب پر
کچھ بُلبلے چلے ہیں، مگر ٹوٹ جائیں گے

اس شہرِ سنگ زاد میں پیڑوں کو دیکھنا
شاخوں سے جن کی، کچّے ثمر ٹوٹ جائیں گے

رشتوں کا گر لحاظ نہ رکھا، انیسِ جاں
کہنہ رفاقتوں کے شجر ٹوٹ جائیں گے

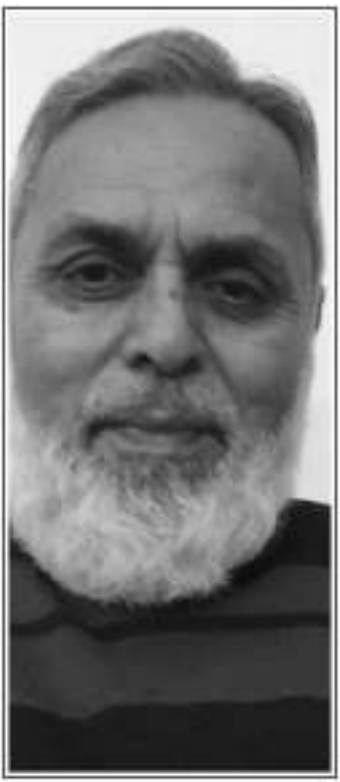

محمد انیس انصاری

غزل

تندی میں ہے بہاؤ نہ موجوں میں جوش ہے
طوفاں کے بعد بولتا دریا خموش ہے

جب خاک سے کسی نے اُٹھایا نہ پھول کو
پھر اس پہ کیا ملال کہ نکہت فروش ہے

مانگے کوئی سحر کی دعا اس نگر میں کیوں
سب جانتے ہیں شب کی فضا پردہ پوش ہے

شاخیں جھکی ہوئی ہیں بہاروں کے بوجھ سے
حد سے زیادہ برگ و ثمر بارِ دوش ہے

مقصود اس کا ہاتھ چھڑانا تھا اس لیے
کہنے لگی ہوا کہ شجر سُست کوش ہے

لگتا ہے آسمان پہ مہتاب دیکھ کر
سارا جہان حسن کا حلقہ بگوش ہے

گلزار نے ضمیر کا سودا نہیں کیا
دیوانگی میں بھی اسے اتنا تو ہوش ہے

گلزار بخاری

غزل

سناٹا مار ڈالے گا کچھ بولیے حضور
اس خامشی کا راز بھی تو کھولیے حضور

اس شہرِ نامراد پہ چھائی ہوئی ہے رات
پھرنے لگے ہیں کوبکو سنپولیے حضور

منصف ضروری کام میں مشغول ہے ابھی
کم تولیے، کم تولیے، کم تولیے حضور

وجدان و وجد اعلیٰ و ارفع ضرور ہیں
بستی ہے پارساؤں کی، مت ڈولیے حضور

یہ داستانِ آہ و فغاں ہے بہت طویل
مٹی میں اشک اپنے نہیں رولیے حضور

عظمیؔ جی جا رہے ہیں کدھر یہ خبر نہیں
بس پیچھے پیچھے آپ کے ہم ہو لیے حضور

اسلام عظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لڑکھڑا کر دم نہ دے دیں ڈگمگاتی دوریاں
دل میں بجھتی لو کی صورت کپکپاتی دوریاں

غزل

بادل کے نام دشت کا پیغام کیا ہوا؟
کچھ تو کہو کہ پیاس کا انجام کیا ہوا؟

اک چاپ میرے ساتھ رہی تا حدِ سفر
وہ شخص ہم سفر مرا ، دو گام کیا ہوا

تُو نے تو شہرِ ہجر میں ڈیرے لگا لیے
اک تجربہ وصال کا ناکام کیا ہوا

چھاؤں سمجھ کے لوگ تجھے ڈھونڈنے لگے
سورج کی طرح حسن ترا عام کیا ہوا

اے ساقیٔ خیال! تری بزم کب لُٹی؟
گردش کہاں رُکی؟ وہ ترا جام کیا ہوا؟

جمشید ڈُوبتے ہوئے سورج کو علم ہے
تاروں کو کیا خبر کہ سرِ شام کیا ہوا؟

جمشید چشتی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گمرہی! تجھ کو ہماری پارسائی کی قسم
دیکھ لینا! ایک دن جی بھر کے پچھتائیں گے ہم

غزلیں

جب خیالِ وصال آتا ہے
کچھ نہ کچھ تو ملال آتا ہے

زیست مشکل ہے یا بہت آساں
لب پہ اکثر سوال آتا ہے

وقت جیسے کوئی مچھیرا ہے
لے کے ہاتھوں میں جال آتا ہے

آدمی سوچتا نہیں پہلے
بعد میں کیوں خیال آتا ہے

زندگی ایسی سلطنت جس کو
دھیرے دھیرے زوال آتا ہے

لوٹ جاتا ہوں مقبروں کی طرف
جب کسی کا خیال آتا ہے

ٹھیک ہے کارِ عشق میں اقبال
آتے آتے کمال آتا ہے

اقبال سروبہ

کیا عجب کردار جاگے آئنوں کے سامنے
آنکھ پتھر ہو رہی تھی منظروں کے سامنے

شہر سارا سو گیا تھا نیند کی آغوش میں
میں اکیلا رو رہا تھا رت جگوں کے سامنے

لوگ گھر میں بیٹھ کر کرتے ہیں باتیں شوق سے
کون جا کر بولتا ہے منصفوں کے سامنے

میں نے دیکھی ہیں چراغوں میں بہت سی شوخیاں
گُم ہوئے جاتے ہیں سارے سورجوں کے سامنے

کب اُنھیں اقبال ملتی ہیں خودی کی منزلیں
سر جھکا دیتے ہیں جو بھی خواہشوں کے سامنے

غزل

پہلے جن آنکھوں میں تھی سپنوں کی بھیڑ
اُن کے دامن میں ہے اب اشکوں کی بھیڑ

مانگنے کے ہیں طریقے مختلف
شاہی ایواں میں بھی ہے منگتوں کی بھیڑ

خانقاہوں پر ہے بھوکوں کی قطار
جیسے شمع پر ہو پروانوں کی بھیڑ

کوئی رہبر ہے نہ منزل کا نشاں
جائے تو جائے کہاں اندھوں کی بھیڑ

بینا آنکھوں کا بڑا فقدان ہے
یُوں تو ہے چاروں طرف آنکھوں کی بھیڑ

ایک جیسے ہیں یہاں شاہ و گدا
شہرِ خاموشاں میں ہے کتبوں کی بھیڑ

عام شہری ہیں سحرؔ کاسہ بدست
ہر گلی میں لگ گئی کاسوں کی بھیڑ

اکرم سحر فارانی

غزل

مجھے دونوں میں راحت ایک سی تھی
خودی تھی یا وہ ثاقبؔ بے خودی تھی

مجھے چشمے نظر کے بیچنا تھے
مگر بستی وہ نابیناؤں کی تھی

نکل آئی وہ آخر چیخ بن کر
بڑی مدت سے جو خواہش دبی تھی

وہی جیتا سخن کے معرکے میں
لبوں پر جس کے گہری خامشی تھی

مری خواہش تھی میرے ہم قدم ہو
وہ گرچہ ساتھ میرے چل رہی تھی

میں اپنی سوچ سے کیسے مکرتا
مرے نزدیک تو یہ خودکشی تھی

مجھے موقف بدلنا پڑ گیا تھا
کہ اس کی بات بالکل منطقی تھی

سرِ بزمِ تفکر ہم نے دیکھا
خیالوں میں بلا کی روشنی تھی

منظور ثاقب

غزل

محبت آنجہانی ہو گئی ہے
سپرد خاک رانی ہو گئی ہے

وبا پھیلی ہے جو مشرق تا مغرب
قیامت کی نشانی ہو گئی ہے

سو اپنے مشترک آزار باعث
مشابہہ زندگانی ہو گئی ہے

یقیں آتا نہیں اس آئینہ پر
سے کی کھینچا تانی ہو گئی ہے

سبھی شرمندہ ہیں اپنے کیے پر
نظر بھی پانی پانی ہو گئی ہے

عجب ہے کھلبلی ہر ایک جانب
عجب سی زندگانی ہو گئی ہے

کسی پچھلی گلی میں ڈھونڈ جاکر
سے کی رائیگانی ہو گئی ہے

ہماری ایک پل کو آنکھ بھیگی
سو دل کی ترجمانی ہو گئی ہے

ملا رخشندہ خاموشی کا عندیہ
تری پوری کہانی ہو گئی ہے

رخشندہ نوید

غزل

جو لوگ روٹھ گئے تھے اُنھیں مناتے ہوئے
میں مٹ رہا ہوں سبھی فاصلے مٹاتے ہوئے

بنیں گے اشک یقیناً تمھارے درِ نجف
پڑھنا یادِ علیؑ میں انھیں بہاتے ہوئے

ترے فراق میں جاگا ہوا تھا برسوں کا
میں سو گیا تھا تجھے لوریاں سُناتے ہوئے

دُکھوں نے اس طرح یلغار مجھ پہ کر دی تھی
میں رو پڑا تھا غموں کی ہنسی اُڑاتے ہوئے

ہمارے ہاتھ بھی پھولوں سے ہو گئے زخمی
زمیں پہ بکھری ہوئی پتیاں اُٹھاتے ہوئے

ترازو سیدھا رکھیں ان میں حوصلہ ہی نہیں
خیال رکھنا تھا منصف انھیں بناتے ہوئے

یہ حادثہ نہیں، انصاف کا قرینہ تھا
وہ راکھ ہو گئے خود بستیاں جلاتے ہوئے

پلٹ کے گاؤں بھی اب میں تو جا نہیں سکتا
اُجڑ گیا ہوں ترے شہر کو بساتے ہوئے

انہی کے دم سے جہاں میں گلاب کھلتے ہیں
جو اپنے سر سے گئے سولیاں سجاتے ہوئے

عقیل دیکھ لے مسمار، ہو چلا ہوں میں
دلوں کے بیچ کی دیوار کو گراتے ہوئے

عقیل رحمانی

غزل

گھر میں پڑا ہوں بن کے جو گوشہ نشین میں
کھونے لگا ہوں رشتوں پہ شاید یقین میں

مُدّت سے مجھ کو ملنے نہیں آیا کوئی بھی
لگتا ہے ہو گیا ہوں خلا کا مکین میں

رکھتا ہوں ٹھوکروں پہ شہا تخت و تاج کو
پھر کیسے تیرے در پہ جھکاؤں جبین میں

لیتا ہوں تیرے ہجر میں یوں وصل کے مزے
یادوں کو تیری رکھتا ہوں پہلو نشین میں

میرے لیے تو دشت بھی دریا سے کم نہیں
اس کو بھی اب تو رکھتا ہوں دل کے قرین میں

کوئی عدو ہو میرا کہ جاں سے عزیز دوست
پھیلا رہا ہوں سب میں محبت کا دین میں

اہلِ جنوں نے دے دیا مُرشِد کا مرتبہ
اہلِ خرد کی نظروں میں ہوں کم ترین میں

مانا کہ واجبی سے ہی تھے میرے خدّ و خال
لیکن تھا ماں کے واسطے سب سے حسین میں

شامل ہیں میری مٹی میں اشرف وفا کے رنگ
دُنیا میں امن و آشتی کا ہوں امین میں

اشرف نقوی

غزل

رہی ہیں تشنہ ہماری یہ خواہشیں کتنی
ہوئی ہیں اُن کی اگرچہ نوازشیں کتنی

مگر دریچے بہت سے تو بند رہتے ہیں
اگرچہ لطف کی ہوتی ہیں بارشیں کتنی

ہمارے وقت نے ٹھونسی ہے روئی کانوں میں
حیات کرتی رہی ہے سفارشیں کتنی

نہیں سکوں کے شگوفے کسی بھی ٹہنی پر
رُتوں نے کی ہیں مری جاں یہ سازشیں کتنی

رہے ہیں جذبے یہ فاروقؔ پھر بھی قابو میں
اگرچہ ہوتی مِری ہیں ستائشیں کتنی

زبیر فاروق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزلیں

اوڑھ کر خوشبو گلابی فروری کی دُھوپ میں
پڑھ رہی ہوں نظم اس کی فروری کی دُھوپ میں

برف زاروں سے نِکل کر آئی ہوں مدت کے بعد
زندگی تُجھ سے ملوں گی فروری کی دُھوپ میں

وقت کی اپنی تمازت دل کی اپنی بولیاں
ساتھ ہوں تتلی کے میں بھی فروری کی دُھوپ میں

زندگی کی اوک میں کچھ ملگجے سے رنگ ہیں
پھُول ہیں کچھ کاسنی بھی فروری کی دُھوپ میں

دیکھ فرحت کون آیا ہے سرِ بامِ خیال
گُھل رہی ہے اِک دھنک سی فروری کی دُھوپ میں

فرحت زاہد

سوچا ہے اُسے خون کی حدت کے سِوا بھی
ہے دِل میں کسک اور محبت کے سِوا بھی

موسم کی طرح شاخ پر اودے کبھی پیلے
ہوتے ہیں کئی رنگ تو چاہت کے سِوا بھی

کام آیا نہیں حرفِ تسلی میرے ہمدم
اس درد میں کچھ اور ہے شدت کے سِوا بھی

کچھ سازشی کردار کہانی میں رہے ہیں
بکھرے ہوئے لشکر کی ہزیمت کے سِوا بھی

کیا صورتِ احوال ہے گریہ ہے نہ آنسو
ہوتے ہیں کئی داغ ندامت کے سوا بھی

غزل

ستارے مجھ کو مرا حال کیا بتاتے ہیں
تری طرح سے کسی بات کو چھپاتے ہیں

اداس کمرے کے گلدانو! انتظار کرو
ہم ان لبوں سے ابھی پھول چن کے آتے ہیں

گلہ نہیں وہ مرے ساتھ کیوں نہیں روتے
یہی بہت ہے مرے ساتھ مسکراتے ہیں

یہ ہم پہ خاص مقدر کی مہربانی ہے
کہ ہم تو کچے گھڑے پہ بھی ڈوب جاتے ہیں

ہمارے شہر کی گلیوں میں ہو کا عالم ہے
ہمارے شہر میں آسیب دندناتے ہیں

سہارا دیتے بھی کیا لڑکھڑاتے قدموں کو
سنبھل بھی جاؤں تو اپنے مجھے گراتے ہیں

زمیں سے تاروں بھرا آسمان دیکھتے تھے
اب آسمان پہ بیٹھے زمیں بناتے ہیں

اندھیری رات کے آنچل میں بیٹھنے والے
عجیب لوگ ہیں سورج سے خوف کھاتے ہیں

یہی ٹھکانہ میسر ہے سر چھپانے کا
ہم اپنے گھٹنوں میں دیکر یہ سر چھپاتے ہیں

کسی بھی در کسی دیوار کا نشان نہیں
ہم اپنے گھر میں کہاں راستہ بناتے ہیں

وہ رفتگاں جنہیں رفتہ ہوئے زمانہ ہوا
وہ آسمانوں پہ واپس ہمیں بلاتے ہیں

درخت کوئی مسلمان ہو بھی سکتا ہے
یہ ہم درختوں کو پھر کس لیے جلاتے ہیں

مسعود احمد

غزل

اس کی حیرانیوں سے ظاہر ہے
سب پشیمانیوں سے ظاہر ہے

درد گہرائیوں میں اترا ہے
نیلگوں پانیوں سے ظاہر ہے

پھر مکیں لوٹ کر نہیں آئے
گھر کی ویرانیوں سے ظاہر ہے

سیل بستی ڈبو کے چھوڑے گا
اس کی طغیانیوں سے ظاہر ہے

بے جہت ہو گئے ہیں لوگ یہاں
ان کی پیشانیوں سے ظاہر ہے

لگتا ہے عشق جیت جائے گا
اس کی جولانیوں سے ظاہر ہے

عقل ہی اب تو ہار مانے گی
دل کی نادانیوں سے ظاہر ہے

درد ایسے ہی جگمگائے گا
اس کی تابانیوں سے ظاہر ہے

کوئی موقع کی تاک میں ہے جلیل
سخت نگرانیوں سے ظاہر ہے

احمد جلیل

غزل

خون کہاں اِن میں تو یادیں بستی ہیں
ورنہ دل کے چاروں خانے خالی ہیں

جب خوش رہنا سیکھ لیا تنہائی میں
اُس لمحے دیوار پہ شکلیں اُبھری ہیں

اپنے آپ سے لڑنا کتنا مشکل ہے
دونوں طرف سے چوٹیں خود کو لگتی ہیں

چاند سا چہرہ سُونے گھر میں چمکا ہے
خواب میں رہنے والی آنکھیں جاگی ہیں

آندھی میں وہ پیڑ تو گر کر ٹوٹ گیا
لیکن وہاں پہ چڑیاں شور مچاتی ہیں

صرف سُنا ہے، دیکھا نہیں جو کہتے ہیں
پار اُفق کے پریاں تیرے جیسی ہیں

آنسو گرتے خوشبو ہونے لگی ظہور
اُس کے ہجر کی سب دیواریں کچی ہیں

ظہور چوہان

غزلیں

اس لئے میں نے ذرا کم ہی اٹھائی بھائی
تری دنیا مجھے اک آنکھ نہ بھائی، بھائی

مجھ کو آتی ہیں نظر باپ کی بوڑھی آنکھیں
تجھ سے کرتا ہوں اگر میں بھی لڑائی بھائی

رقص کرتے ہوئے دستار کا شملہ نہ کھلا
عشق نے یوں تو بہت خاک اڑائی بھائی

صرف اک بار کیا سورۂ اخلاص کا ورد
نیند پھر ایسی مجھے ٹوٹ کے آئی بھائی

میں نے ہر گام محبت کے جلائے ہیں دیے
عمر بھر میں نے یہی کی ہے کمائی بھائی

دستِ قاتل تھا توقف سے گریزاں ورنہ
مرنے والے نے تو آواز لگائی، بھائی

تجھ سے بس ذکر وفاؤں کا کیا ہے شاہد
کوئی تہمت تو نہیں تجھ پہ لگائی بھائی

افتخار شاہد

کیا پوچھتے ہو درد کے ماروں کا ان دنوں
یار و خراب حال ہے یاروں کا ان دنوں

غنچے کھلے تو زخم بھی سینے کے کھل اٹھے
ایسا چلا ہے زور بہاروں کا ان دنوں

دریا کے ساتھ رابطہ اتنا شدید تھا
پوچھا نہ ہم نے حال کناروں کا ان دنوں

اس واسطے بھی کوچ سے روکا ہے آپ کو
بگڑا ہوا چلن ہے ستاروں کا ان دنوں

رونے کے واسطے کوئی کاندھا نہیں ملا
ایسا پڑا ہے کال سہاروں کا ان دنوں

عزت خلوص دوستی چاہت تلاش کی
لیکن پتہ چلا نہیں چاروں کا ان دنوں

غزل

ایک دو تین لمحے زندگی کے
باقی جو بچ گئے وہ شاعری کے

تم ہو کچھ دن سے میرے نرغے میں
اور میں کچھ دن سے اپنی سادگی کے

کوئی جنگل مجھے دکھائی دیا
میں نے نشے لیے سپردگی کے

خوب رنگینیاں میسر ہیں
رنگ اجلے بہت ہیں دوستی کے

شوق سے گنگنائے جاتے ہیں
ہم ہیں اوتار تیری نغمگی کے

کوئی مستانہ اس طرف آئے
اور نعرے لگائے دشمنی کے

میں رضا سے تمہاری بات کروں
لوگ سمجھیں اشارے خامشی کے

نعیم رضا بھٹی

غزل

ہجر لمحوں کا دھواں ہو تو غزل ہوتی ہے
اشک آنکھوں سے رواں ہو تو غزل ہوتی ہے

قلزمِ عیش و طرب راس کہاں ہے مجھ کو
کرب کی جوئے رواں ہو تو غزل ہوتی ہے

ندرتِ شعر تخیل سے نہیں ہے ممکن
حرف میں تاب و تواں ہو تو غزل ہوتی ہے

گرچہ ماحول کا بھی اپنا اثر ہے لیکن
دل میں احساس جواں ہو تو غزل ہوتی ہے

جذبۂ عشق بھی ہوتا ہے کبھی لاحاصل
خوبیٔ حسن بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے

یوں بھی ہوتا ہے نہاں خانۂ دل میں گاہے
غم کی تاثیر نہاں ہو تو غزل ہوتی ہے

بات جب بنتی نہیں حرف و قلم سے دانش
ہاتھ میں تیر و کماں ہو تو غزل ہوتی ہے

اعجاز دانش

غزل

تری آنکھ میں وہ جو خواب تھا اُسے بھول جا
کھلی آنکھ تو وہ نہیں رہا اُسے بھول جا

ترے قلب میں جو خیال تھا اُسے یاد رکھ
جو نہیں مِلا تو نہیں مِلا اُسے بھول جا

وہ بہار بن کے جو چھا گیا وہ قرار تھا
جو چلا گیا تو چلا گیا اُسے بھول جا

جو خمار تھا ترے ذہن پر اُسے کر فزوں
جو غبار تھا اُسے بھول جا، اُسے بھول جا

کوئی درد ہو، کوئی کرب ہو اُسے دے اُڑا
تجھے بے وفا نے بُھلا دیا اُسے بھول جا

ترے ہاتھ میں جو لکیر تھی اُسے کر عیاں
مِرے یار آ، مِرے ساتھ آ، اُسے بھول جا

یہ محبتوں کا طریق ہے اِسے پیار کر
وہ حقارتوں کا تھا راستہ اُسے بھول جا

اُسے رنج و غم تو نواز دے کسی شام کو
یہی زندگی کا ہے فیصلہ، اُسے بھول جا

ریاض ندیم نیازی

غزل

ٹوٹ جائے نہ میرے دل کا ساز
کہ نہیں تیرے نام کی آواز

کیے جاتا ہے روح کو روشن
تیرے غم کی ہو یارا! عمر دراز

دشت بھی دشت سا نہیں رہتا
یہی ہوتا ہے عشق کا اعجاز

جانتا ہوں کہ بے کنار ہے تو
دید کا شوق تو ہے بندہ نواز

ہر نظر مجھ پہ ہی ٹھہرتی ہے
کیسا بخشا ہے عشق نے اعزاز

جان لے لے نہ تیرے محسن کی
دیکھ اپنا یہ دلربا انداز

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل میں غبار ہونے کی طاقت نہیں رہی
نس نس جو دوڑتا تھا ، وہ پارا نہیں رہا

غزل

برق ہنستی تھی، گھٹا دیکھتی جاتی تھی مجھے
اور اک سبز پری پاس بلاتی تھی مجھے

کر لیا کرتا تھا اک پیڑ سے ساری باتیں
پتے پتے سے مہک تیری ہی آتی تھی مجھے

بانسری بجتی ہوئی دور کسی بیلے میں
سرد راتوں میں نئے خواب دکھاتی تھی مجھے

چاند جب ڈوبنے لگتا تھا پسِ شاخِ سحر
تو صبا لوریاں دے دے کے سلاتی تھی مجھے

آنکھ کھلنا بھی عجب خواب نما ہوتا تھا
جب وہ ممتا بھری آواز جگاتی تھی مجھے

دشتِ بے خواب میں اب کان ترستے ہیں اسے
جو صدا لوریاں دے دے کے سلاتی تھی مجھے

وقت ہی وقت ہوا کرتا تھا بے پایاں وقت
جب مہ و سال کی گنتی نہیں آتی تھی مجھے

سجاد بلوچ

غزل

ہوتی ہے جہاں خاک سے تعمیر ہماری
بنتی ہے اُسی چاک پہ زنجیر ہماری

اِک پھول کا تعویذ بنا رکھا ہے ہم نے
ہر باغ کی خوشبو ہے خبر گیر ہماری

ہم نقشِ سیہ تھے کسی دیوارِ سیہ میں
تجھ آنکھ سے روشن ہوئی تصویر ہماری

ہم وقت سے پہلے بھی پہنچ جائیں اگر گھر
دستک سے عیاں ہوتی ہے تاخیر ہماری

مضموں تو چرا لیں گے یہاں لوگ ہمارے
باندھیں گے مگر کس طرح تاثیر ہماری

اُس شہر میں رہتے ہیں کرایے کے مکاں میں
جس شہر میں موجود ہے جاگیر ہماری

عنبرین صلاح الدین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کب یہ دیوار بے رُخی نہ رہے
کیا خبر کب وہ اجنبی نہ رہے

غزلیں

دیکھا ہے ماحول معطر، جب جب مہکے پھول
دنیا کی ہیں رونق شوکت، گجرے، غنچے، پھول

چشمِ حیراں نے بھی دیکھے، کیسے کیسے پھول
لیکن، اب تک بھول نہ پایا، دل میں اترے پھول

مثلِ برگِ گل نہ جانو، ان ہونٹوں کو ہرگز
من آنگن میں کانٹے بوئیں، چلتے پھرتے پھول

ہلکی ہلکی خوش بو جن کی، سانسوں کو مہکائے
سانجھ سویرے کون یہ بھیجے، چنبیلی کے پھول

جگمگ جگمگ کرتے ڈوبے، جانے کتنے چاند
خاک کی چادر اوڑھ کے سوئے جانے کتنے پھول

آج بھی من میں آگ لگائے، اک ناری کی یاد
جاں سوزی کو پاس رکھے ہیں آج بھی سوکھے پھول

پھولوں سے کیا رشتہ شوکت، پھولوں سے کیا میل
جس کی قسمت میں ہو صحرا، وہ کیا جانے پھول

شوکت محمود شوکت

سانجھ سویرے، گھر آنگن میں کھلتے دیکھے پھول
سندر سندر، کومل کومل، پیارے پیارے پھول

اب تک اس نے پھولوں ہی سے پیار کیا تھا پیار
اس کو یہ معلوم نہیں تھا، خار چبھوئے پھول

من آنگن تاریک ہو جب تو کیسا نور، اُجالا
دل کی بستی ویراں ہو تو کیسے غنچے، پھول

گلشن گلشن بلبل چہکے، قمری بولے کُو
فصلِ گل میں جب جب مہکیں اودے، پیلے، پھول

کانٹوں پر تھا پل پل گزرا، حالت بھی تھی غیر
اس کو میں نے جب بھیجے تھے ڈرتے ڈرتے پھول

زخم، وفا میں جو جو پائیں، ان کو جانیں لعل
پیار کا رستہ چلنے والے، سمجھیں کانٹے، پھول

غزل

کیا دل نے بھی عادتیں رکھی ہیں
ہم سے بھی بغاوتیں رکھی ہیں

تم نفرتیں بانٹنے میں مشغول
ہم نے وہی چاہتیں رکھی ہیں

جیبوں سے نکالتے نہیں کچھ
لفظوں میں سخاوتیں رکھی ہیں

ہیں دام و درم سے ہاتھ خالی
جیبوں میں ضرورتیں رکھی ہیں

تیرے پیچھے تو ہم سے اب تک
یاروں نے رقابتیں رکھی ہیں

منہ سے کوئی کم ہی بولتا ہے
آنکھوں میں وضاحتیں رکھی ہیں

اب کے شرفا کا حال ہے یہ
نیلام پہ عزتیں رکھی ہیں

دل ڈوب رہے ہیں ریگِ نم میں
ساحل پہ محبتیں رکھی ہیں

کچھ ان کے ہیں ہم پہ شکر واجب
کچھ ہم نے شکایتیں رکھی ہیں

ہم پر تو فلک نے توڑنے کو
کیا کیا نہ قیامتیں رکھی ہیں

یاروں کو گلہ ہے ہم سے روشن
کس شخص سے نسبتیں رکھی ہیں

اعجاز روشن

غزل

بظاہر ایک بندہ سامنے ہے
حقیقت میں یہ مولا سامنے ہے

شناور بحرِ عرفاں کے بنو تم
یہ مت سمجھو کہ قطرہ سامنے ہے

منصور کا جو علمِ باطنی تھا
وہی خارج میں نقشہ سامنے ہے

یہی سب فتنہ و شر کی ہے بنیاد
سمجھ لینا پرایا سامنے ہے

زباں پر لگ گیا ہے قفلِ وحدت
بتاؤں کیا مرے کیا سامنے ہے

طریقت میں ہے یہ حق کی تجلی
شریعت میں یہ دنیا سامنے ہے

جنونِ عشق اس کو ''عین'' سمجھا
خرد کہتی ہے دھوکا سامنے ہے

مگر ناپید ہے وہ یار جانی
اگرچہ دیر و کعبہ سامنے ہے

نگاہوں سے ہے مخفی رازِ ہستی
فقط پُتلی تماشا سامنے ہے

سنو منصور کی ، دیکھو نہ اُس کو
الستی مے کا نشہ سامنے ہے

اگر فیضانؔ مٹ جائے من و تو
تو وہ خود ہی سراپا سامنے ہے

فیض رسول فیضان

غزل

میں نے تجدیدِ غمِ جاں سے نکھارے شب و روز
کتنی مشکل سے پسِ پشت اُتارے شب و روز

زندگی تو نے کبھی قدر شناسی نہیں کی
میں نے بے لاگ عقیدت سے سنوارے شب و روز

آج ناسور بنے ہیں مری یادوں کے لیے
تیرے ہمراہ محبت میں گزارے شب و روز

ڈھونڈتا ہوں میں لیے آنکھ میں سورج اکثر
کیا ہوئے ہائے مری آنکھ کے تارے شب و روز

کتنے مانوس ہوئے تھے مری فطرت کے سبب
جاتے جاتے پیچھے سے پکارے شب و روز

عین ممکن ہے کہ ساعت بھی نہ گزرے تم سے
میں نے تنہائی میں جس طرح گزارے شب و روز

عابدی اب بھی گیا وقت رچا ہے مجھ میں
پھر بلاتے ہیں مجھے کر کے اشارے شب و روز

علی حسین عابدی

غزل

معلوم ہی پڑتی نہیں تصویر ہماری
لے آئی ہے کس جا ہمیں تقدیر ہماری

اک روز اسی خاک میں مل جائیں گے ہم لوگ
جس خاک سے منسوب ہے تعمیر ہماری

آشفتہ سری دشت کی میراث نہیں ہے
اُڑتی ہوئی ہر خاک ہے زنجیر ہماری

معلوم سے آگے بھی ہیں کچھ خواب ہمارے
افلاک سے آگے بھی ہے جاگیر ہماری

اُس بزم میں شرکت کریں ممکن ہی نہیں ہے
جس بزم میں ہوتی رہے تحقیر ہماری

رہبر ہی کو پہچان نہیں پائے ہیں ہم لوگ
ہے صورتِ حالات جو گھمبیر ہماری

جو پھول دیے ہم نے، اُنہیں چوم کے دیکھو
ہونٹوں تلک آ جائے گی تاثیر ہماری

تعذیر ہو جو بھی، ہمیں تسلیم ہے آصف
معلوم تو کچھ ہو ہمیں تقصیر ہماری

آصف شفیع

دو غزلہ

مجھے جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
مگر کہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

کہیں نہیں کوئی چہرا تمھارے جیسا مگر
یہاں وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

جہاں جہاں بھی کوئی دیکھنے کی صورت ہو
وہاں وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

وہاں وہاں کوئی مجھ سا بھی لازمی ہو گا
جہاں جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

جہاں جہاں کوئی دیکھے ، جو دیکھ سکتا ہو
وہاں وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

عیاں عیاں کئی چہرے ہیں چار سُو میرے
نہاں نہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

تمھارے چہرے سے نظریں ہٹاؤں تو دیکھوں
کہاں کہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

میں دونوں ہاتھ ملاتا ہوں جب دعا کے لیے
تو درمیاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

نہ حرزِ جاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
نہ مہرباں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

بصد یقین کوئی خوش گمان دیکھے تو
بہرگماں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

لہو میں دوڑتے اک سُرخ اضطراب کے ساتھ
رواں دواں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

کہیں شبیہہ سے ملتی تو ہو شبیہہ کوئی
کہوں کہ ہاں! کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

ہزار آئنہ بینی کا اہتمام کیا
مگر وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

مجھے خبر ہے یہاں کوئی بھی نہیں تُم سا
سو رایگاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

عیاں ہے داغِ عبادت سرِ جبینِ سلیم
پسِ نشاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

محمد سلیم ساگر

غزل

اک دن جلا نہ دے مجھے پروانگی مری
کر لیجیے قبول یہ نذرانگی مری

ہاتھوں میں سنگ لے کے سبھی لوگ آ گئے
مشہور شہر میں ہوئی دیوانگی مری

ہر اک مریضِ دل مرے زیرِ علاج تھا
بدنام کر گئی ہے حکیمانگی مری

وارفتگیٔ شوق نے رُسوا بہت کیا
آخر ڈبو گئی مجھے میخانگی مری

تقدیر نے پچھاڑ دیا ہے قدم قدم
آئی کِسی نہ کام یہ فرزانگی مری

کٹ ہی گئے سکون سے فاقہ کشی کے دن
دیتی تھی حوصلہ مجھے مستانگی مری

کل تک تو کتنے شیش محل زیرِ پا رہے
یک دم زوال میں ڈھلی شاہانگی مری

خود اپنے دشت ہی میں چمکتا ہوں آفتاب
مجھ سے ہی تابناک ہے ویرانگی مری

آفتاب خان

غزل

بحث نہیں ، تکرار نہیں
الفت میں اصرار نہیں

کیسا جیون ہے جس میں
جینے کے آثار نہیں

دیکھ تماشا جادو کا
سایا ہے ، دیوار نہیں

دور ہماری منزل ہے
رستا بھی ہموار نہیں

میری پوجا مت کیجے
میں کوئی اوتار نہیں

مجنوں میرا بھائی ہے
میرا برخوردار نہیں

میری درد کہانی میں
میرا ہی کردار نہیں

جتنی دنیا ہے انصر
اتنے ہم ہشیار نہیں

انصر حسن

غزل

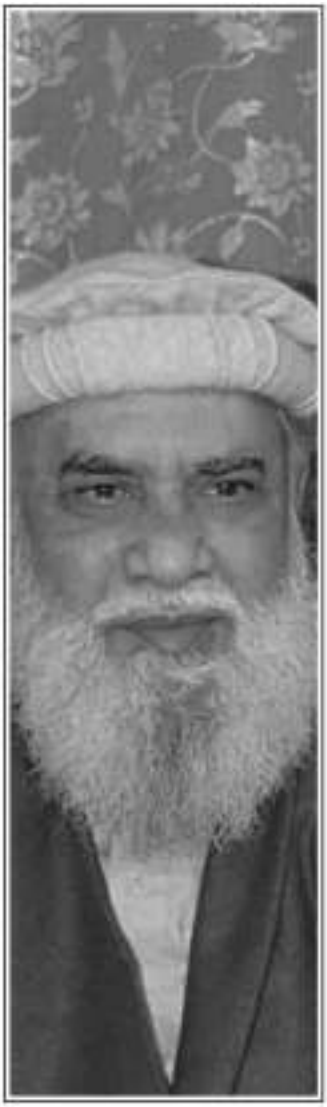

جیسے دریا برد کر دی لاش ، پتھر باندھ کر
اس نے بوڑھا کر دیا بیٹی کو ہی، گھر باندھ کر

وہ پرندوں کو پکڑتا ہے، لگا کھیتوں میں جال
چھوڑ دیتا ہے مگر سب کو ہی پھر، پر باندھ کر

لے کے پھر آیا ہے اک فہرست الزامات کی
کس قدر خوش ہے وہ سب کے سب مرے سر باندھ کر

ایک دن پہلے بھی، وہ جو کر چکا ہے قتل عام
آج پھر گھر سے نکل آیا ہے خنجر باندھ کر

ایک حد تک اس نے دے رکھا ہے سب کو اختیار
اس سے آگے لے کے جاتا ہے مقدر باندھ کر

پھر نئے انداز کی لکھے گا وہ تازہ غزل
پھر نئے مضمون لے آئے گا شاعر باندھ کر

ساری خوشیاں بھر کے رکھتا ہوں میں اپنی جیب میں
میں نے رکھ چھوڑا ہے اک گٹھڑی میں سب ڈر باندھ کر

روز ملتا ہے مجھے اکرم وہ اس ندیا کے پاس
روز ملتا ہوں اسے اکرم تصور باندھ کر

اکرم ناصر

غزل

حیراں کر دیتا ہے لے رب تری قدرت کا مزاج
آگ کو ملتا ہے جب پھولوں کی خصلت کا مزاج

زندگانی کو بڑے چین سے جینا ہے مجھے
میں نے اپنایا ہے بس اس لئے خلوت کا مزاج

اس کے بن ایک بھی دن مجھ سے نہ کاٹا جائے
بن گیا یار واب ایسا مری چاہت کا مزاج

صرف ہونٹوں کو ہی کلیوں کے مشابہ نہ کہو
اس کی تخلیق میں ہی ضم ہے نزاکت کا مزاج

اور کسی میں تو نہیں حوروں میں مل سکتا ہے
جو مرے یار میں ملتا ہے نفاست کا مزاج

جب سے تعمیر سے تخریب در آئی اس میں
ہم کو اچھا نہیں لگتا ہے سیاست کا مزاج

مانگے بے مانگے سبھی طرح تو دیتا ہے رب
پھر بھی سمجھے نہیں ہم سب تری رحمت کا مزاج

یہ کسی حسنِ پری زاد کا احسان نہیں
مجھ کو رب نے ہے دیا پیار محبت کا مزاج

ویسے ہی پھول شرر بار طبیعت ہے لئے
جیسے ہے برف کی تاثیر میں حدت کا مزاج

آج ہر دل میں تری عظمتیں ہوتیں قائم
تو غضب کی جگہ رکھتا کہیں شفقت کا مزاج

ذکی طارق

غزل

کیا کیا اڑان بھرتے ہیں پر کے بغیر بھی
کتنے سفر کیے ہیں سفر کے بغیر بھی

جس میں ترے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا
دیکھا ہے اک جہان ، نظر کے بغیر بھی

یہ کائنات لگتی ہے اپنا مکاں مجھے
گھر میں رہا ہوں میں سدا گھر کے بغیر بھی

ہر خاص و عام ملتے ہیں درویش سے جہاں
دربار کچھ تو ہوتے ہیں در کے بغیر بھی

ورنہ تو اپنے آپ سے وحشت سی ہے مجھے
نیکی کا کام کرتا ہوں ڈر کے بغیر بھی

یہ معجزے بھی اس کی محبت میں ہو گئے
شہکار کچھ تراشے ہنر کے بغیر بھی

شوکت کسی بھی گھر میں جو ماں کا وجود ہو
رہتی ہے اس میں چھاؤں شجر کے بغیر بھی

افتخار شوکت

غزل

اک ایسی کیفیت خود پر سدا طاری کروں گا میں
محبت ایک سے، اک سے اداکاری کروں گا میں

کوئی روٹھا تو اس کے واسطے پیسہ بہاؤں گا
کسی کی خاطر آنکھوں سے ندی جاری کروں گا میں

گیا موسم مرے آنگن پلٹ کر آ بھی سکتا ہے
بنا کر ایک رستہ، چار دیواری کروں گا میں

یہ ہے کردار مشکل پر بآسانی نبھاؤں گا
جو سنگ آئے تو بدلے میں گہرباری کروں گا

مزاحم اس لیے ہوتا نہیں ہوں پیش قدمی میں
اگر مفتوح ہو جاؤں گا سرداری کروں گا میں

اسے تخریب کہنے سے رکے گا ارتقا کیسے
نئی تعمیر کی خاطر جو مسماری کروں گا میں

ہمیشہ تو نہیں ممکن اسے راہِ مفر ملنی
بالآخر اس کی پیشی کے سمن جاری کروں گا میں

محبت سے کماؤں گا وہ دنیا پر لٹا دوں گا
وسیع اپنے مراسم کی عملداری کروں گا میں

عجب کیا ہے پرودوں شعر میں سارے صدف ریزے
کہاں تک اور اب یہ گریہ وزاری کروں گا میں

بہت شفاف شیشے میں تو جلدی بال آتا ہے
تعلق راست رکھنے کی طلبگاری کروں گا میں

بہت سے المیوں کے راز کھلنے ہی نہیں دوں گا
ہنسوں گا سامنے، چھپ کر عزاداری کروں گا میں

مجھے قائم توازن رکھنے میں خود ڈولنا ہوگا
کہیں دنیا کہیں دل کی طرفداری کروں گا میں

کہ ڈھلتے عمر کے سائے بھلے معلوم ہوں جاذب
حسیں کچھ اور خوابوں کی یہ پھلواری کروں گا میں

اکرم جاذب

غزلیں

گزر جاتے ہو تم تیزی سے اب جانے نہیں دیں گے
افق کے سرخ ماتھے پر شکن آنے نہیں دیں گے

بھلے اس میں چھپا ہے اپنا ماضی اور مستقبل
پھڑکتی دھڑکنوں کو کچھ نیا بھانے نہیں دیں گے

جو ماضی نے کیا بے حال مستقبل کو پھر بھی ہم
اسے ہر حال اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے

سبق لے کر ہی ماضی سے دے خود کو حوصلہ احمد
یہ تجھ کو دوست کی بستی میں اب جانے نہیں دیں گے

علی رضا احمد

ابھی نکل کے فرات سے خشک پیاس آئی
وہ جب بھی آئی غموں کا اوڑھے لباس آئی

یہ زہر کے کڑوے پن میں کتنی مٹھاس آئی
پکڑ کے انگلی جو شام کی شب اُداس آئی

امید کی اس کرن کا سورج وہیں تھا ڈوبا
اندھیرے کو روشنی جہاں پر ہی راس آئی

شروع تو اس نے اپنی کچھ بات بھی نہیں کی
دہن سے ہر سو مہک سی پھولوں کی باس آئی

کسی سحر آگیں بستی سے آیا ہے تو احمد
جہاں فراست بھی کھو کے ہوش و حواس آئی

غزل

کوئی تدبیر کرو دل مرا بہلانے کی
عادتیں چھوٹیں گی کب تک یونہی شرمانے کی

گھر کی ویرانی سے اب خوف مجھے آتا ہے
اب تو ہمت بھی نہیں لوٹ کے گھر آنے کی

میں تو ہر پل تجھے جینے کی دعا دیتا ہوں
کب تلک دے گا دعائیں مجھے مرجانے کی

شام سے پہلے ترے پاس میں لوٹ آتا ہوں
اک یہی بات ہے اچھی ترے دیوانے کی

رند تو رند ہیں واعظ بھی چلے آئے ہیں
شہر میں دھوم مچی ہے ترے مے خانے کی

کس طرح تو نے اجاڑا مرے دل کا آنگن
دیکھی جاتی نہیں حالت مرے ویرانے کی

جتنا بھی شکر کروں کم ہے محمد اشفاق
کس قدر مجھ پہ عنایت مرے مولا نے کی

محمد اشفاق بیگ

غزل

چہچہاہٹ سے کوئی بات کہاں جانتا ہے
بس گھنا پیڑ پرندوں کی زباں جانتا ہے

قافلہ جا بھی چکا، مٹ گئے نقشِ کف پا
راستہ دیکھنے والا یہ کہاں جانتا ہے

خود کو گرنے سے کئی بار سنبھالا میں نے
ایک لغزش کو مگر سارا جہاں جانتا ہے

جمع تفریق سے اندازہ لگا مت میرا
میرے بارے میں بہت کم تو میاں! جانتا ہے

جان سکتا ہی نہیں کوئی زمانے بھر میں
جس قدر اپنے مکینوں کو مکاں جانتا ہے

بار بار اپنے تعارف سے خجل ہوتا ہوں
وہ علاوہ مرے سب کو ہی یہاں جانتا ہے

جس قدر جانتا ہوں رات کو شاہد اشرف
دن کے بارے کوئی اتنا بھی کہاں جانتا ہے

شاہد اشرف

غزلیں

میں خوش تھا اس جہانِ بے کراں میں
نہ تھا جب تک تمھارے امتحاں میں

ہوائیں دستکیں دیتی نہیں اب
گلی کے پار رہتا ہوں جہاں ، میں

اداسی کو کہاں پر چھوڑ آؤں
جھلکتی ہے جو اکثر ہی بیاں میں

کہیں پر اک جو ہوتا چاند اپنا
ستاروں جیسے ہوتے آسماں میں

کہانی یہ سمجھ میں آئے گی تب
ان آنکھوں کا جو لاؤں ترجماں میں

بچھڑ جاتا ہے اکثر مجھ سے وہ شمس
کہانی جب بھی پہنچے درمیاں میں

کالی چادر کے ستاروں اور زلفِ یار پر
کچھ سخن ہو کہکشاں کے پھیلتے آثار پر

دیکھ کر تنہا مجھے ، جیسے دیا دیوار پر
مسکراہٹ پھیل جاتی ہے ، رخِ اغیار پر

بن گیا وہ طفلِ ناداں ، کاغذِ سرکار میں
جس نے کیچڑ ہے اچھالی با حیا کردار پر

پاؤں زخموں کے ہیں عادی، دل بھی غافل درد سے
ترس آتا ہے مجھے چبھتے ہوئے اک خار پر

بابری ہے نام جس کا، سن لے اے ہندوستاں
جنگ صدیوں تک رہے گی مسجدِ مسمار پر

کاغذوں پر ہیں لکھے دیوان کتنے شمس ، پر
شعر وہ ہے ، نقش ہو جو دل کی ہی دیوار پر

آفتاب محمود شمس

غزل

دل یہیں پر ہے، گماں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا
درد سینے میں جہاں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

تو نے یک بارگی جا کر تو قیامت کر دی
چاند نظروں سے نہاں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

ہاتھ ہنستے ہیں مگر آنکھ چھلک جاتی ہے
قافلہ جونہی رواں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

میری فطرت مجھے رونے نہیں دیتی کھل کر
درد آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

آگ جلتی بھی نہیں اور سلگتا بھی ہے دل
ایسی صورت میں دھواں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

روز آتے ہیں نظر چاند سے چہرے مجھ کو
روز ہی دل کا زیاں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

داستاں پوری تو ہوتی ہے کہیں بین سطور
عشق شعروں میں بیاں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

میں یقیں سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ عشق ہی تھا
ہاں مگر مجھ کو گماں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

یوں تو صدیاں ہوئیں چھوڑے ہوئے کوچہ ان کا
آج بھی ذکرِ بتاں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

دل کی آواز ہے یا چاپ گزرتے پل کی
جانے یہ شور کہاں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

ایسے لگتا ہے مجھے دور بلاتا ہے کوئی
جب بھی احساس اذاں ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا

علمدار حسین

غزل

ایک طُوفان ہے ٹالا نہیں جا سکتا
یاد کو دِل سے نِکالا نہیں جا سکتا

اب تِری دید کی خواہِش ہے اِن آنکھوں کو
اب اِن آنکھوں سے اُجالا نہیں جا سکتا

میرے کِردار کے باعِث ہے مِری عِزّت
میری پگڑی کو اُچھالا نہیں جا سکتا

کِسی ظالِم کو محبت نہیں ہو سکتی
کِسی پتّھر کو اُبالا نہیں جا سکتا

تُو ہے اِنسان ، خُدائی کا نہ دعویٰ کر
تُجھ سے تو خُود کو بھی پالا نہیں جا سکتا

اے مِرے دوست! مسافت ابھی باقی ہے
اے مِرے دوست! یہ چھالا نہیں جا سکتا

محمود کیفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شام تو ہم نے کر لی مگر
تجھ بن کیوں کر ہو گی سر

غزلیں

گلوں پہ ظلم و ستم بد قماش کرنے لگے
نیا چمن کوئی ہم بھی تلاش کرنے لگے

سنا ہے اب کے فلک مہرباں ہے لوگوں پر
ہمارے درد کا درماں بھی کاش کرنے لگے

ہو ایسی کرنوں کی یلغار جو تسلسل سے
اندھیر نگری کے بت پاش پاش کرنے لگے

تو کیسے مہکے یہاں بوئے شاخِ زیبائی
صبا چمن کے اگر راز فاش کرنے لگے

رضا اللہ حیدر

جو زخم بور اٹھانے لگا تو دیکھیں گے
ہمارا عشق ٹھکانے لگا تو دیکھیں گے

ابھی تو ٹیسیں ہیں مدھم سی کیف آوری
جو درد نیر بہانے لگا تو دیکھیں گے

ہیں خوب شیر و شکر اور گاڑھی چھنتی ہے
وہ راز ہم سے چھپانے لگا تو دیکھیں گے

ہمارے دل میں وہ اپنی جگہ بناتا ہے
ہمیں وہ اپنا بنانے لگا تو دیکھیں گے

ادیب چھوڑ کے کارِ ہنر، کہوں کیسے
سنہری وقت بھی وقفِ معاش کرنے لگے

مرے خیالوں کے گلشن میں فکرِ نو کے رضا
پرندے آنے لگے، بود و باش کرنے لگے

ابھی تو آنکھوں سے میٹھے کلام کرتا ہے
مراسم اور بڑھانے لگا تو دیکھیں گے

افق کے پار رضا چاند مسکراتا ہے
وہ آنکھ جھیل میں آنے لگا تو دیکھیں گے

غزل

مشکل اک ایک راہ کی، دیوار ہٹ گئی
اچھا ہوا غموں کی سیہ رات کٹ گئی

سائے میں والدین کے، خوشحالیاں رہیں
بدبختی جن کے بعد کچھ ایسے لپٹ گئی

قسمت کی یاوری کا تو اتنا ہی بس کہوں
تدبیر میں نے جو بھی کی یکسر الٹ گئی

کوئی جگر کا گوشہ کہاں ہے کوئی کہاں
ہستی ہے کتنے حصوں میں اپنی یہ بٹ گئی

بربادیاں ہی اس کا مقدر دکھائی دیں
مرکز سے اپنے قوم یہ کچھ ایسے ہٹ گئی

مُجھ جیل سے بخاری کسی طور کم نہ تھا
اس کی تمام عمر کہ جس گھر میں کٹ گئی

پہچان اپنی آپ وہ عاصم نہ کر سکا
تصویر گردِ وقت سے یوں اس کی اٹ گئی

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حال دل کس طرح کہوں خالد
وہ مرا احترام کرتا ہے

غزل

بے سود دل میں درد کے انبار مت لگا
میں کہہ رہا ہوں یار تو اے یار! مت لگا

ظلِ پناہ ! حکم کی تعمیل ہے مگر
اے دل! سمجھ یہ عشق کا دربار مت لگا

دیوار جاں بھی چاٹتا ہے دل کے ساتھ غم
اس جی کو، میری جان! یہ آزار مت لگا

قحطِ وفا ہے شہر میں، دل کی دکاں نہ کھول
افراطِ دردِ ہجر ہے بازار مت لگا

صد حیف، چارہ گر! یوں تری معذرت پہ حیف
مرہم بنا کے لفظ کا بے کار مت لگا

کنزِ فراقِ یار کا مخبر ہے اشک اشک
عاطف! کہا تھا آنکھ میں اخبار مت لگا

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کُھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا ، مجھے حیران رکھنا

غزل

کوئی بھی لقمہ دیارِ بخیل سے نہ ملا
ہمیں تو ایک بھی جرعہ سبیل سے نہ ملا

بڑے قریب سے دیکھا ہوا ہے دنیا کو
کسی طرح سے مجھے اِس ذلیل سے نہ ملا

تری طلب میں جوانی گزر گئی ہے مگر
کوئی جواب بھی تیرے قبیل سے نہ ملا

جسے بھی چاہا ہے میں نے دماغ سے چاہا
یہ حوصلہ بھی دلِ خود کفیل سے نہ ملا

بہت سے لوگوں نے چاہا ہے اُس کو پہلے اسد
وہ عشوہ باز کسی بھی دلیل سے نہ ملا

اسد اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دھوئیں کی طرح ہواؤں میں ہو گیا تحلیل
خیال پر نہ چڑھا حرف و صوت کا پارا

غزل

کب میں نے کہا ہے کہ زباں ٹھیک نہیں ہے
لیکن ترا اندازِ بیاں ٹھیک نہیں ہے

آؤ کہ کریں غور کہیں بیٹھ کے دونوں
کس درجہ غلط میں تو کہاں ٹھیک نہیں ہے

سب بھر گئے جو بھی تھے مرے زخم نمایاں
بس ایک وہی زخمِ نہاں ٹھیک نہیں ہے

گر جاں کی اماں پاؤں تو کچھ عرض کروں میں
دو چار حوالوں سے جہاں ٹھیک نہیں ہے

کچھ ذکر کتب کا یا کتب خانوں کا کرلیں
ہر وقت کا یہ ذکرِ سناں ٹھیک نہیں ہے

ہو شب کو اُجالا تو چلو ٹھیک ہے لیکن
ہو دن کو اگر شب کا سماں ٹھیک نہیں ہے

اے شہر کے والی ذرا تو دیکھ نکل کر
ہر سمت پہ شعلے یہ دھواں ٹھیک نہیں ہے

جس شخص نے ہر بار کیا امن و اماں کو
اس شخص سے امیدِ اماں ٹھیک نہیں ہے

ماحول بدلنے سے بدل جاتا ہے سب کچھ
تبدیل کرو جسم کہ جاں ٹھیک نہیں ہے

کوشش نہ کرو بھول نہ پاؤ گے عطا تم
بے سود ہے یہ کارِ زیاں ٹھیک نہیں ہے

عطا العزیز

غزل

ذرا عزمِ سفر دیکھا تو جاتا
بہ تا حدِ نظر دیکھا تو جاتا

فقط پرواز پر ہی تھیں نگاہیں
نہیں ہیں بال و پر دیکھا تو جاتا

نہ جانے لکھ دیا تھا کیا جنوں میں
مرا خط کھول کر دیکھا تو جاتا

بہت سے بوجھ ہیں کاندھے پہ میرے
جھکی کیسے کمر، دیکھا تو جاتا

ہماری منزلیں جو کھو گئی ہیں
ہے کیسا راہبر دیکھا تو جاتا

ترستی ہی رہیں جس کو نگاہیں
وہ کیسا ہے نگر، دیکھا تو جاتا

زمانہ خوف میں ڈوبا ہوا ہے
ہے کس کا دل میں ڈر دیکھا تو جاتا

اگرچہ غم کے ڈیرے ہیں دلوں میں
ہوئی کیوں چشم تر دیکھا تو جاتا

بظاہر راکھ کا تھا ڈھیر انجم
نہ ہو اس میں شرر دیکھا تو جاتا

محمد افضال انجم

غزل

کس نے پھر آسماں پہ رکھا ہے
دل کا ٹکڑا کہاں پہ رکھا ہے

میں ضروری تھا سو زمانے کو
اپنے گھر کہکشاں پہ رکھا ہے

کچا وعدہ تھا گیلے موسم کا
آج بھی اِس زباں پہ رکھا ہے

تُم مجھے دیکھنے کو آئے ہو
دیکھ لو دل یہاں پہ رکھا ہے

میں تو ٹھہرا ہوا ہوں حیرت پر
کس نے اب تک رواں پہ رکھا ہے

یہ محبت پرانے گھر جیسی
اِک دیا داستاں پہ رکھا ہے

کار آمد تھا دل ترا امجد
اس نے کیوں رائیگاں پہ رکھا ہے

امجد بابر

غزل

جھیل سیف الملوک کا پانی
یہ ہے اہلِ سلوک کا پانی

صاف و شفاف آئنوں جیسا
آب جُو میں چکوک کا پانی

آب زر سے ہیں نقش تابنے پر
نقرئی ہے سکوک کا پانی

بہہ رہا ہے نواحِ بستی میں
آپ کی بھول چوک کا پانی

ہم فقیروں کو ہے کہاں حاصل
شہر یار و ملوک کا پانی

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہوا کی طرح صحرا سے گزر جا
سفر میں کیا سر و سامان رکھنا

غزلیں

زمانہ چلتا رہے گا بڑی سہولت سے
بہت سے لوگ جڑے ہیں ابھی محبت سے

سراہتا ہے زمانہ مجھے تبھی جاناں
کشید کرتی ہوں مصرع تمہاری صورت سے

وہ میرے سامنے غیروں کے ساتھ جیتا رہا
میں دیکھتی رہی اس کو بڑی ہی حیرت سے

جہاں پہ لوگ اجالوں سے بھر رہے ہیں بدن
ہماری آنکھ بھری جا رہی ہے وحشت سے

بس اک خیال کے آنے پہ ڈر کے بیٹھ گیا
جو لڑ رہا تھا بڑے حوصلے سے، ہمت سے

رخسانہ سمن

تمہارے ساتھ گزاری ہر ایک ساعت کو
تمام عمر نبھائیں گے ہم محبت کو

ہمارے دل میں سمائے گی یار تاریکی
ہماری آنکھ اکٹھا کرے گی وحشت کو

تمہارا ہجر مرے ہاتھ میں جوان ہوا
بڑے ہی ناز سے پالا ہے اس اذیت کو

چھڑی تھی جنگ محبت کے نام پر جو کبھی
نبھا رہے ہیں قبیلے اسی عداوت کو

ہے گھیر لیتا مجھے جب خزاؤں کا موسم
میں دیکھ لیتی ہوں نعمان تیری صورت کو

غزل

کچھ نہ کچھ تو سدھر رہا ہو گا
درد آخر بکھر رہا ہو گا

ڈگمگائے تو ہوں گے پاؤں ترے
جب تو دل سے اُتر رہا ہو گا

میں بھی مصروف ہو گیا ہوں بہت
تو بھی کچھ کام کر رہا ہو گا

اب مرے بعد عین ممکن ہے
وقت اچھا گزر رہا ہو گا

دھوپ کھڑکی سے جھانکتی ہو گی
تیرا چہرہ نکھر رہا ہو گا

تو نہانے کو جا رہی ہو گی
آئنہ بھی سنور رہا ہو گا

تیری آنکھوں سے پھوٹتا چشمہ
غم کے دریا کو بھر رہا ہو گا

عمران اعوان

غزل

چھپ کے ہر بات سن رہا ہو گا
ہجر دیوار سے لگا ہو گا

یہ ترقی پذیر بستی ہے
کل سگِ دہر، بھیڑیا ہو گا

منجمد جھیل ہے محبت بھی
اندر اندر ہی تیرنا ہو گا

خود کشی قتل بن چکی ہو گی
اب وہ تنہا نہیں رہا ہو گا

اس گلہری کی عمر میں مَیں نے
کتنے پیڑوں کو سر کیا ہو گا

کون ہو گا مرا وکیل جہاں
خواب ہوں گے نہ کافکا ہو گا

برف چٹخے گی اور پرندوں میں
لوٹ جانے کا مشورہ ہو گا

لوگ آگے نکل گئے ہوں گے
اور وہ فٹ پاتھ بن گیا ہو گا

دھوپ سایہ نہیں ہے سورج کا!
ان ستاروں کو کچھ پتا ہو گا

گرم جوشی کی آگ تھی عادل
سرد خانہ کہاں بچا ہو گا

ذوالفقار عادل

غزلیں

وقت کا ہر جبر سہہ کر دن بسر کر لیں گے ہم
تیرگی کو روشنی کا ہم سفر کر لیں گے ہم

ہم زباں سے حالِ دل کیوں کر سنائیں آپ کو
سامنے آ کر فقط یہ آنکھ تر کر لیں گے ہم

دیکھنا، وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے
دل میں ان کے خامشی سے پل میں گھر کر لیں گے ہم

جانتے ہیں چوٹ کھا کر دل بہت پچھتائے گا
اعتبارِ دوستاں بھی اس قدر کر لیں گے ہم

اُن کے در سے اُٹھ گئے تو دیکھنا اک دن عروج
داستانِ زندگی کو مختصر کر لیں گے ہم

عروج درانی

زمانے کی نظروں میں کب خاص ٹھہرے
جو بن کر مرے دل میں احساس ٹھہرے

کوئی اُس سے کہہ دے کہ جلدی نہ جائے
ذرا دیر کو تو مرے پاس ٹھہرے

ہماری نظر میں وہ دل معتبر ہے
ہر اک کے لیے جس میں اخلاص ٹھہرے

مٹا دے کوئی دل کی اس تشنگی کو
کہیں پر تو جا کر مری پیاس ٹھہرے

عروج اُس نے پھر سے چھڑایا ہے دامن
کہاں دل کو یہ ہجر اب راس ٹھہرے

غزل

بدستِ حُسن جو جلوہ فروخت ہوتا ہے
ملال یہ ہے کہ سستا فروخت ہوتا ہے

کہیں نہ دام مُناسب ملیں تبسم کے
کہیں پہ اشک بھی مہنگا فروخت ہوتا ہے

روا ہے شہر میں اب کے وہ شعبدہ بازی
کہ ہر گلی میں تماشہ فروخت ہوتا ہے

یوں تنگ دستی برتتے ہو خوش مزاجی میں
تمہارا جیسے رویہ فروخت ہوتا ہے

قریب ہے کہ وہ مقروض کردے نسلوں کو
کہ ایک پیڑ کا سایہ فروخت ہوتا ہے،

کہاں پہ ذائقے تم ڈھونڈنے ہو نکلے حسن
یہاں تو شہد بھی کڑوا فروخت ہوتا ہے

عطاالحسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ناقدروں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

غزل

تباہ حال معیشت بنا کے رکھ دی ہے
یہ کیسی دیس کی حالت بنا کے رکھ دی ہے

اکابرینِ سیاست نے پوری دنیا میں
بنامِ فرد قیامت بنا کے رکھ دی ہے

یقین مان کہ سجدوں سے کچھ نہیں حاصل
اگر ریا ہی، عبادت بنا کے رکھ دی ہے

اب اور حوصلہ باقی نہیں ہے چلنے کا
رہِ طلب رہِ عبرت بنا کے رکھ دی ہے

ہم آئنوں پہ پڑی گرد جھاڑ سکتے ہیں
مگر خود اپنی جو صورت بنا کے رکھ دی ہے

رواں رکھے گی محبت غمِ جہاں میں ہمیں
یہ مشکلوں میں سہولت بنا کے رکھ دی ہے

سرور ملنے لگا ہے مجھے پرستش سے
جو دل لگی تھی عقیدت بنا کے رکھ دی ہے

اگرچہ فاصلہ بھی درمیاں دکھایا گیا
دلوں کے درمیاں قربت بنا کے رکھ دی ہے

ضروری کام کوئی جیسے بھولا ہوتا ہو
محبت آپ نے عادت بنا کے رکھ دی ہے

عنبرین خان

غزل

کھیل دنیائے عارضی کا ہوں
ایک کِردار زندگی کا ہوں

مجھ کو رکھا گیا اندھیرے میں
مَیں بھی حقدار روشنی کا ہوں

اِنتہا کے قریب ہے دنیا
آدمی آخری صدی کا ہوں

دل کو احساس ہو گیا تیرا
معترف تیری دوستی کا ہوں

مَیں نے غربت میں عِلم سیکھا ہے
مَیں تو مقروض مفلسی کا ہوں

پُر نہ ہو گا جو میرے بعد کبھی
ایک ایسا خَلا کمی کا ہوں

میرا دشمن نہیں خیالی کوئی
دوست بھی مَیں کسی کسی کا ہوں

زبیر خیالی

غزل

میں نے قسمت کو آزمایا تھا
وہ مری زندگی میں آیا تھا

میں نے اپنا سمجھ لیا تجھ کو
تو جو اپنا نہیں پرایا تھا

اس کے دل میں تھا کوئی پہلے سے
جس کسی سے بھی دل لگایا تھا

ساتھ تیرے رہا جو برسوں سے
میں نہیں تھا وہ میرا سایہ تھا

خواب میں اک خیال تھا شاید
اس نے جیسے گلے لگایا تھا

میرے آنگن میں پھول کھلتے گئے
وہ جو بھولے سے مسکرایا تھا

روشنی میں جو میرے ساتھ رہا
میں تھا، تُو تھا، یا میرا سایہ تھا

وہ تصور تھا یا کوئی تصویر
تیرے آنے پہ کون آیا تھا؟

وقت ساکت، مقام بھی ساکت
حسن نے معجزہ دکھایا تھا

راجہ عبدالقیوم

غزل

ہجر اُس کا مرے اعصاب پہ یوں طاری تھا
بعد مرنے کے بھی آنکھوں سے لہو جاری تھا

اتنی جلدی صفِ ماتم سے نکل آئے ہو
یار تم کو تو بہت زعمِ عزاداری تھا

کیا بتاؤں تجھے فرقت کے دنوں کی حالت
مجھ پہ ہر روز قیامت کی طرح بھاری تھا

ہم بضد تھے کہ ہمیں وصل کی سرشاری ملے
وہ مگر وعدہ وفا کرنے سے انکاری تھا

کیسے ممکن تھا کہ میں تیغِ عدو سے ڈرتا
جب شرف میرے بزرگوں کا علمداری تھا

میں نے اُس وقت بھی تجھ کو تہہِ دل سے چاہا
شغل جس دور میں لوگوں کا ریاکاری تھا

سب پہ قرآن کے اَسرار نہیں کھل سکتے
قاتلِ حضرتِ شبیر بھی تو قاری تھا

کس لیے تیرے تغافل سے بدل جاتا میں
مسئلہ میرا محبت میں وفاداری تھا

عقل میں بھی نہ مری سُود و زیاں آتے تھے
دل تو کرتا ہی محبت کی طرفداری تھا

گھر بھی کب تھا مرے آرام و سکوں کا باعث
دشت بھی میرے لیے قریۂ بیزاری تھا

وقت پڑنے پہ مجھے سب کی سمجھ آتی تھی
کس قدر فیض رساں لمحۂ دشواری تھا

اُسے مارا گیا مسلک کی بنا پر ازور
جس کا پیغام زمانے میں رواداری تھا

ازور شیرازی

غزل

کارِ فسوں میں گم ہے بشر کائنات کا
مہنگا پڑا ہے سب کو سفر کائنات کا

نکلیں گے حسرتوں کے جنازے زمین سے
جب بھی کریں گے چاک جگر کائنات کا

مسکن وہیں بناتا میں سدرہ کے آس پاس
ادراک مجھ کو ہوتا اگر کائنات کا

اک بار مجھ کو اِذنِ الٰہی ملے تو میں
نقشہ بناؤں بارِ دگر کائنات کا

کھلتا ہے عرشیوں کو دکھانے کے واسطے
دو تین بار دن میں یہ در کائنات کا

کیسے گزار لیتے ہیں صدیاں یہاں پہ لوگ
ہر شب مجھے نگلتا ہے گھر کائنات کا

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

غزل

بیٹھا ہوا ہے خاک پہ اب دل سنبھال کر
کس نے کہا تھا خود سے مسلسل کلام کر

وحشت، شراب، حسن، جوانی یہ میکدہ
پہلے یہ ساری لذتیں خود پر حرام کر

کر یوں نہ گفتگو مرے ناکام عشق پر
ایسے تو یار میرا نہ جینا حرام کر

دو دن کی زندگی ہے یہ ہنس کر گزار دے
نفرت کو چھوڑ پیار کو الفت کو عام کر

اب آگہی ملی ہے تو اس کے ستم بھگت
میں نے کہا نہیں تھا کہ مت ایسے کام کر

پھر کرنا تم نصیحتِ پاکیزگی مجھے
پہلے تو اپنے آپ سے حجت تمام کر

انسانیت کے نام پہ دھبہ ہیں جتنے لوگ
تاثیر ایسے لوگوں کا مت احترام کر

تاثیر جعفری

غزل

وہ لوٹ آیا تو اس سے ضرور پوچھوں گی
کیا تھا کس نے تجھے مجھ سے دور پوچھوں گی

مجھے ملا جو کہیں کوئی ہجر کا مارا
ملا ہے عشق میں کتنا سرور پوچھوں گی

اسے بتانا پڑے گا مری خطا کیا ہے؟
ضرور ایک دن اپنا قصور پوچھوں گی

صلہ یہ کیسا دیا ہے مری وفاؤں کا؟
کیوں میرے دل کو کیا چور چور، پوچھوں گی

مجھے ستا کے تمہیں کیا سکون ملتا ہے؟
میں ہاتھ جوڑ کے اک دن حضور، پوچھوں گی

بچھڑنے والے ترے ہجر میں گنوایا جو
دلا سکو گے؟ وہ آنکھوں کا نور، پوچھوں گی

سمیرا اس نے سرِ بزم مجھ کو جھنجھوڑا
سمجھ کے مان کو میرے غرور پوچھوں گی

سمیرا یوسف

غزل

ہونے لگی تھی روشنی، کل آسماں کے بیچ
چلتی رہی ہوں رات کو میں، کہکشاں کے بیچ

ہوتی تھی ہمکلام بھی، سوچوں میں اس طرح
جیسے وہ سچ میں آ گیا، میرے گماں کے بیچ

اردو سے نابلد تھی، سو! سمجھی نہ کوئی بات
میں فاصلے پہ ہی رہی، ان ہم زباں کے بیچ

ہجر و وصال، ہی رہے ہیں، ذہن پر سوار
یہ زندگی پھنسی رہی، سود و زیاں کے بیچ

اک ربط ہی رہا سدا، دونوں کے درمیان
اک رشتہ ایسا بن گیا، گل، باغباں کے بیچ

کوکی گل

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

اے عشق ! اگر مجھ کو ترا اذن ہو ممکن
آغوش میں لے لوں، ترے پیکر کی مہک بھی

غزل

اپنی تو کوئی بھی شے پاس نہیں رکھی ہے
ہاں تری ذات مگر اپنے تئیں رکھی ہے

تا کہ دشواری نہ ہو ان کو یہاں آنے میں
میں نے خوابوں تلے آنکھوں کی زمیں رکھی ہے

میں ستارہ ہوں مگر گرد جمی ہے مجھ پر
میری پیشانی پہ سوچوں کی زمیں رکھی ہے

وہ مرے سامنے ہو کر بھی نہیں ہوتا ہے
یعنی اک پیاس ہے دریا کے قریں رکھی ہے

کس کا ہے لمس رگ و پے میں سرایت کرتا
کس نے کاندھے پہ مرے گرم جبیں رکھی ہے

تیری یادیں یہاں حوروں کی طرح رہتی ہیں
دل نہیں سینے میں فردوسِ بریں رکھی ہے

جس جگہ تجھ کو مرے دوست کبھی دیکھا تھا
میری وہ پہلی نظر اب بھی وہیں رکھی ہے

گو کہ اب دل نہیں موجود مرے سینے میں
ہاں تری یاد مگر اب بھی یہیں رکھی ہے

علی رضا بلوچ

غزل

احمد محسود

اے شہرِ خستہ حال ترے بام و در کی خیر
ہر ایک گھر کی خیر ہو ہر اک بشر کی خیر

تخریب کار سنگ لئے صف بہ صف کھڑے
مالک مجھے ہو جو ہو مرے چارہ گر کی خیر

یہ معرکہ یہ جنگ ہے اپنوں کے درمیاں
مولا اِدھر کی خیر ہو مولا اُدھر کی خیر

ہیں بے ہنر، ہیں عیش پرست اہلِ اختیار
کوزہ گروں کی خیر ہو دستِ ہنر کی خیر

اے حسنِ بے نیاز یہاں پر صد احتیاط
یہ حاسدوں کا شہر ہے سو خوش نظر کی خیر

مقتل سے پہلے ایک یہی بات دل میں ہے
دستار کا وقار رہے دوست سر کی خیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

غزل

بگڑی سے یا بناؤ سے مجھ سے لپٹ گیا
آسیب عشق کا تھا مِرا جی اُلٹ گیا

پونجی تمام عمر کی آنکھوں میں بھر کے میں
اُس کے درِ نیاز پہ رکھ کر پلٹ گیا

صحنِ چمن میں نخلِ تمنّا کی دار پر
میرا وجود نیست کی آری سے کٹ گیا

ہم کوہ کن کہاں کے تھے، مزدورِ عشق تھے
سایہ فریبِ عشق کا ہم سے لپٹ گیا

کیا سنگ سنگ چلتے ہم اُس دل رُبا کے آہ
دامن خوشی کے جَیب کا طالع سے کٹ گیا

کوہِ ہمالیہ کی طرح سرفراز تھا
گُھٹنوں کے بَل چلا تو مرا قد سمٹ گیا

"دُنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ"
خیمہ فصیلِ جاں کا بالآخر گھسٹ گیا

عارضؔ ترے گلاب ہیں اور اُن کی چاہ میں
دیوانہ وار جو بڑھے تو دل ہی پھٹ گیا

سرفراز عارض

غزل

اک تمنا ہی کے ہاتھوں میں فنا ہو جانا
اس سے بہتر ہے کسی دکھ کی دوا ہو جانا

میرے اہدافِ محبت میں یہ بھی شامل ہے
ہر کسی چاک گریباں کی نوا ہو جانا

وہ سمجھتے ہیں کہ یہ جاں سے گزر جانا ہے
عشق ہے ساعتِ حیرت میں فنا ہو جانا

تجھ کو چھونے کی اجازت ہو، مگر نظروں سے
جرم سے بھی کہیں بڑھ کر ہے سزا ہو جانا

یہی معراجِ سخن ہے وہ اگر سمجھیں تو
حرف ہونٹوں پہ نہ آنا کہ ادا ہو جانا

انتہا ایک، سفر کی ہے کسی راہ چلو
اس کو پا لینا ہو یا خود سے جدا ہو جانا

دل کے اغراض و مقاصد کی یہ ترتیب، مگر
کتنا بر تر ہے کسی دل کی دعا ہو جانا

میں، حبیب! اپنے لیے، سب کے لیے زندہ ہوں
مجھ کو آتا نہیں دنیا سے ورا ہو جانا

بشیر احمد حبیب

غزل

غار تھا غار کی تنہائی تھی آگے میں تھا
دفعتاً آگ سی لہرائی تھی آگے میں تھا

اسی ٹیبل پہ جہاں بیٹھ کے کھاتے تھے کبھی
تو کسی اور کے ساتھ آئی تھی آگے میں تھا

رات کھڑکی سے کوئی چیز گری کمرے میں
موم بتی سی وہ تھرائی تھی آگے میں تھا

زندگی میں تجھے رستے سے اٹھا لایا ہوں
تو کسی اور سے ٹکرائی تھی آگے میں تھا

پیشرو کوئی سرِ راہِ نجف تھا ہی نہیں
پیچھے پیچھے مری مولائی تھی آگے میں تھا

عقیل عباس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاہتیں کب ہیں صرف باتیں ہیں
جانِ جاں کوئی جان وارے بھی

غزل

قبول ہے دلِ ناداں کو ہر کہا اُس کا
یہ کون ہے جو سُناتا ہے مُدّعا اُس کا

بُھلا دیا تھا جسے وقت کے تھپیڑوں نے
ہوائے شب نے مگر ذکر کر لیا اُس کا

سراب ہوتی ہوئی موج کی طلب میں کہیں
بھٹک گیا ہے زمانے سے ناخُدا اُس کا

طویل چُپ کی سراسیمگی قیامت میں
بحال ہو ہی گیا دل سے رابطہ اُس کا

اَجل نہیں کہ وہ رستہ ہے زندگانی کا
بہت چکھا ہے زمانے نے ذائقہ اُس کا

طویل شب کی برانگیختہ سیاہی میں
چمک رہا ہے بہت دور نقشِ پا اُس کا

بہت ہی خوش ہوا اک دن یہ راز جان کے وہ
بہت اکیلا ہے اُس کی طرح خُدا اس کا

زاہد خان

غزلیں

نگاہِ یار کو موزوں سبھی خراب آئے
سو ہم سے لوگوں پہ تھے سارے ہی عتاب آئے

وہ چاند جس کے نظارے کو بارہا تڑپے
سنا ہے غیر کی محفل وہ بے حجاب آئے

ہمی ہیں کوزہ گر و کوزہ و گلِ کوزہ
دیارِ یار میں ایسے کئی سراب آئے

جہاں پہ بحث ہو حسن و جمال کے تیری
ہمارے پاس بھی ایسا کوئی نصاب آئے

ہمیں بھی شوقِ خسارہ ہے عشق و مستی میں
ہمارے پاس بھی تیرا کوئی حساب آئے

بصد خوشی سے میں لکھ دوں گا ایک لاکھ غزل
مگر وہاں سے بھی عثماں کوئی جواب آئے

عثمان حنیف

تمہارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم کدھر جاتے
اگر ذرا سا مری جان! تم سنور جاتے

ہماری شہر نوردی کا یہ تقاضا تھا
تمہارے شہر میں آتے مگر گزر جاتے

تھے خاک و خس جو اگر ہم تو وہ تھا بادِ جنوں
گر اس سے ربط بڑھاتے تو ہم بکھر جاتے

رہے رہینِ تمنائے مے کشی ہم بھی
اگر نہ رہتے تو ساقی کبھو کے مر جاتے

ہمیں ملا نہیں صحراؤں کا پیام کوئی
تلاشِ قیس میں ہم بھی اِدھر اُدھر جاتے

یہ اور بات کہ بیٹھے رہے ترے در پر
نیا سا شہر بسا لیتے ہم جدھر جاتے

جو کشتی چھوڑی تو دریا میں ڈوبنا واجب
مگر تمہارے لیے ہم خوشی سے مر جاتے

ہمیں سراغِ کفِ پا کوئی نہ ملتا پر
سفر کی گرد سے کچھ تو سنور سدھر جاتے

تمہارے حکم پہ جانا ہمیں نہ تھا موزوں
ہمیں یہ علم تھا عثمان پر مگر جاتے

غزل

بزمِ ہستی میں مرا بس مختصر سا ہے سفر
اور میں انجامِ ہستی سے بہت ہوں بے خبر

نوکِ مژگاں پر مری موتی چمکتے رہ گئے
مجھ کو جرمِ عشق میں چڑھنا پڑا ہے دار پر

داستانِ ہجر میں تیرا تعاقب میں کروں؟
مَیں بہت بے جان ہوں، حاصل نہیں ہیں بال و پر

زاہدوں کو کیا پتہ مہر و وفا کی تلخیاں
وہ تو جانیں فتویٰ بازی اور وعظِ بے اثر

میں سفیرِ عشق تھا، خود سے رہا تھا احتراز
اس لیے تو پھر رہا ہوں جا بجا، اب دربدر

بے رُخی اُس پھول سے کیسے کرے کوئی بھلا
وہ رخِ زیبا تو سب کا دل لُبھائے ہر نظر

ابنِ ساقی کیوں کہے طنز و کنایہ میں تجھے
تُو حریفِ عشق ہے تیرا دُروں نا معتبر

حسن ابن ساقی

غزل

فاصلہ کچھ بھی کم ہوا ہی نہیں
پاس رہ کے بھی دل ملا ہی نہیں

ایسے ڈوبے کہ پھر اُبھر نہ سکے
اور تنکے کا آسرا ہی نہیں

منزلیں خاک ڈھونڈتے ہم لوگ
لوٹ آئے ہیں راستہ ہی نہیں

بن سنور کے ہیں روبرو بیٹھے
آئینہ ہم کو دیکھتا ہی نہیں

زندگی سوگ میں کٹی شاہد
مسکرانے کا حوصلہ ہی نہیں

رانا محمد شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا دن تھے کہ گلیاں سمٹ آئی تھیں گھروں میں
یہ دھوپ سرِ کوچہ و بازار کہاں تھی

غزلیں

نارسی داد رسوں کی تھی جو مارے گئے تھے
ایسے ہی دار تلک جاں نہیں ہارے گئے تھے

مدتوں بعد ملا تھا وہ بہت افسردہ
درد تھے جتنے سنائے مجھے سارے گئے تھے

راہ میں بعدِ مسافت وہ شجر آیا تھا
بارِ سرسائے میں اسکے جو اتارے گئے تھے

ذوالفقار شاذ

کیا بات کرے کوئی حرماں کے ازالوں کی
مرہون صدائیں ہیں اب چند نوالوں کی

مسرور ہیں میروشہ پر کیف شبستاں ہیں
اور باس جھروکوں سے آتی ہے وصالوں کی

اندام ہی تھا ایسا اوروں سے نہ کیوں کہتے
تھا شوخ، ادائیں بھی تھیں شوخ مثالوں کی

اک عکس سے ناوک کے اب لوگ لرزتے ہیں
ہے رزم گہِ الفت توفیق جیالوں کی

مری بلا سے کوئی بھی چلن شعار کرو
فضا ملول ہے اس کو تو سازگار کرو

وہ آج بھی اُسی کچے گھڑے کے آسرے ہے
میں آج بھی وہی دریا ہوں اعتبار کرو

حُضورِ حرف کسی شعر کی بُنت کاری
یہ سہل کام نہیں ہے کہ اختیار کرو

تمہارے دھیان سے نکلا ہوں خاص دل سے نہیں
سو اِن دنوں مرے آنے کا انتظار کرو

مقام و مرتبہ بنتا نہیں تھا پھر بھی عدن
میں آ گیا ہوں تو مجھ کو کہیں شمار کرو

شعیب عدن

غزل

میں شفقتِ پیرانہ، میں لُطفِ کریمانہ
میں پیاس کا محور ہوں، میں خود ہی پیمانہ

شاعر کی تعلّی ہوں، میں برقِ تجلّی ہوں
اک حرفِ تسلّی ہوں، میں کثرتِ ریحانہ

میں حرمتِ برگد ہوں، میں قیس کا مرقد ہوں
اک راز کا مرقد ہوں، میں کشفِ فقیرانہ

پُرلطف حکایت ہوں، میں زندہ روایت ہوں
اُس رب کی عنایت ہوں، میں نطقِ کلیمانہ

جلتی ہوئی آتش ہوں، میں شوخیِ تابش ہوں
منصور کی کاوش ہوں، میں دِقتِ دیوانہ

گفتارِ مسیحا ہوں، میں میر کا مصرع ہوں
حالی کی مسدس ہوں، گلزار کا نظمانہ

اک ہاتھ کی تالی ہوں، میں خام خیالی ہوں
آہنگِ غزالی ہوں، میں حجتِ فرزانہ

میں شاخِ بریدہ ہوں، میں غم کا قصیدہ ہوں
برسوں سے رمیدہ ہوں، مل پایانہ کا شانہ

اک رات ہوں، گھاتک ہوں، اک آنکھ کی ٹھنڈک ہوں
میں آخری دستک ہوں، میں بھینٹ، میں نذرانہ

بدمست سا اودھم ہوں، میں سوگ ہوں، ماتم ہوں
میں ضبط کا موسم ہوں ، میں درد کا افسانہ

گلشن کی میں رونق ہوں ، اک دشت ہوں، لق دق ہوں
میں سچ ہوں حیا، حق ہوں، میں بندشِ میخانہ

ماہم حیا صفدر

غزلیں

تعلق میں دراڑ آنے لگی ہے
محبت تم سے اکتانے لگی ہے

بہت مشکل ہے رشتوں کو نبھانا
طبیعت اب تو گھبرانے لگی ہے

وہ چڑیا پیڑ پر آ کر نجانے
پرانا گیت کیوں گانے لگی ہے

مرے لہجے کی اس تلخی سے اب تو
مری گڑیا بھی اکتانے لگی ہے

کہ جھلسانے لگی ہے اس کی حدت
کسے چھو کر ہوا آنے لگی ہے

کیا تھا خود ہی جب ترک تعلق
ہوا کیا اب جو پچھتانے لگی ہے

ہیں جوڑے آسمانوں پر ہی بنتے
یہ اب تو کس کو سمجھانے لگی ہے

خوشی کو ڈھونڈ کر لاؤں کہاں سے
اداسی اب تو تڑپانے لگی ہے

سوچا جو آج خود سے بھی مجھ کو گلہ ہوا
اس بیوفا سے کیوں تھا مرا دل ملا ہوا

میں بھی چھپا سکی تھی نہ لہجے کی تلخیاں
لگتا تھا اسکا دل بھی ہے شائد دکھا ہوا

دونوں نے خامشی سے تھے رستے بدل لئے
میں ہی خفا تھی اس سے نہ وہ ہی خفا ہوا

لہجے میں اسکے بولتی تھیں بدگمانیاں
لگتا تھا وہ بھی اپنے کسی کا ڈسا ہوا

دیکھا اسے جو آج تو آنکھیں چھلک پڑیں
"آنکھوں میں ایک دشت تھا کب سے رکا ہوا"

کہتی تو کس سے کہتی میں پھر دل کی داستاں
ہر ایک شخص دشمنوں سے تھا ملا ہوا

نائلہ راٹھور

غزل

مجھ کم سخن کو میر کا لہجہ بھی چاہئے
وحشت پسند شخص ہوں، ہونا بھی چاہئے

یہ کیا کہ کوئی بات بھی کُھل کر نہ کر سکیں
اک آدھ شعر حُسن پہ کہنا بھی چاہئے

سیراب توڑ کر بھی مجھے ہو نہیں رہا
جو بچ گیا ہوں اس کو بقایا بھی چاہئے

کچھ دن زمانے بھر سے کہیں دُور ہم رہیں
کچھ دن تمہارا ساتھ اکیلا بھی چاہئے

خواہش ہے ہو قیام کسی دشت میں مرا
پھر اس کے بعد پیڑ کا سایہ بھی چاہئے

قُربت میں میری سوچ رہا ہے رقیب کو
دریا بھی چاہیئے اُسے صحرا بھی چاہئے

جھیلا ہے تیرا ہجر، بہت ہی خلوص سے
مجھ کو مری کمائی سے حصہ بھی چاہئے

جامی اک آدھ شخص رہے اُس کا ہم سفر
اک آدھ کھیلنے کو کھلونا بھی چاہئے

مستحسن جامی

غزل

پھرا ہوں دشت میں آوارگی کے جتنا میں
سو جانتا ہوں اسے قیس ہی کے جتنا میں

ہے عمر اس سے بہت کم، سفر زیادہ ہے
سو تجربے میں ہوا زندگی کے جتنا میں

وہ روز شام کو سائے میں بیٹھ جاتی ہے
یہ دھوپ اتنا نہیں جل رہی کہ جتنا میں

غمِ حیات مجھے گھونٹ گھونٹ پی رہا ہے
بچا ہوا ہوں اب اک گھونٹ ہی کے جتنا میں

کچھ اس طرح وہ سمندر مزاج مجھ سے ملا
بجھی نہ اتنی مری تشنگی کہ جتنا میں

تمام عمر کے جتنا میں اک گلی میں چلا
تمام عمر چلا اک گلی کے جتنا میں

غمِ جہاں نے مجھے مجھ سے چھین رکھا ہے
عدیل خود کو ملا ہوں خوشی کے جتنا میں

کوئی سمجھ نہیں سکتا ہے اس کو مر کر بھی
عدیل موت کو سمجھا ہوں جی کے جتنا میں

کشور عدیل جعفری

غزل

آئی ہے عید تم کو بھی اب آنا چاہئے
دل کو بھی اپنی دید سے بہلانا چاہیے

دیکھا ہے چاند میں نے بڑی دیر گھور کر
اب چاند کو زمیں پہ اُتر آنا چاہیے

ہوتی ہے عید اپنے ہی پیاروں کی دید سے
اک سال بعد بچھڑوں کو مِلوانا چاہیے

روزے رکھے ہیں ہم نے مہِ صوم کے تمام
اللہ کا شکر آج بجا لانا چاہئے

آئی ہے عید سب میں لُٹانے کو سرخوشی
دل کھول کر سبھی کو ہی مسکانا چاہیے

مہکی فضا ہے پیرہن عطر بیز سے
اب تو دل و دماغ کو مہکانا چاہیے

خوش بختی کے خزانے ہیں رب نے کئے عطا
سب کو خوشی خوشی گلے لپٹانا چاہیے

خالی ہے جیب دل میں ہیں ارماں بھرے ہوئے
اِنسانیت کو خیر سے شرمانا چاہیے

اِن بے کسوں کے حال پہ کھاؤ گے کب ترس
کیا مفلسوں کو عید پہ مر جانا چاہئے

دل داغ داغ ہے مرا حالِ غریب پر
اِس بے حسی پہ سب کو ہی پچھتانا چاہیے

رُوٹھی ہے اب ہنسی تو کروں کیا شہاب میں
کچھ دیر کے لیے انہیں اپنانا چاہیے

شہاب اللہ شہاب

غزلیں

ہم دلِ زار میں کچھ چاہتیں، ارمان لیے
چل پڑے وقت کا بخشا ہوا نقصان لیے

کتنی آنکھوں نے ضیا پائی ترے چہرے سے
کتنی آنکھیں بجھیں دیدار کا فقدان لیے

تو کہ آتے ہی پلٹ جاتا ہے رستے سے مرے
میں کہ بیٹھا ہوں ترے آنے کا امکان لیے

تم کو گلشن کی ہو رعنائی مبارک جاناں
ہم چلیں ساتھ فقط دشت بیابان لیے

کل اداسی نے گلے لگ کے مجھے چھوڑ دیا
اب کہاں جاؤں بھلا چاک گریبان لیے

فرقتِ یار نے ہم سے ہے نزاکت چھینی
لب ہیں خاموش پھریں چہرا پریشان لیے

سر پہ الزام نہ لو ترکِ محبت کا ثمرؔ
یہ نہ ہو پھرنا پڑے چشم پشیمان لیے

ثمر جمال

کبھی عروج پہ تھے سلسلے محبت کے
لگی نظر تو لٹے قافلے محبت کے

وہ پاس دار تھی اپنے بڑوں کی عزت کی
اٹھا سکی نہ کبھی فیصلے محبت کے

تمھاری سمت فقط خار ہی ہے راہ گزر
ہمارے صاف ہیں سب راستے محبت کے

ہوس پرستی ہے چھائی ہوئی زمانے میں
برائے نام بچے ضابطے محبت کے

ہماری سمت ہیں قسمت کے سب ستارے ثمرؔ
ہماری سمت ہی سب در کھلے محبت کے

برف زمانے [کہانی]

پری تم جانتی، ہماری دنیا میں کئی ''برف زمانے'' آئے؟ ایک بار نہیں، کئی بار۔ آخری ''برف زمانہ'' ایک لاکھ سال پہلے آنا شروع ہوا اور پتہ ختم کب ہوا؟

دس ہزار سال پہلے۔

ان برف زمانوں میں دنیا کے اکثر شمالی علاقے برف کی سینکڑوں فٹ دبیز چادر نیچے چھپے رہے۔

تقریباً سارا آج کا ''روس''۔

آدھا شمالی ''چین''۔

پورا ''کینیڈا''۔

آدھا ''یو ایس اے''

سارا ''سکنڈے نیویا''۔

آدھا شمالی یورپ۔

ان برف سالوں میں جانتی کیا ہوتا؟

جانور شمال سے جنوب کی طرف بھاگتے۔ جو رہ جاتے ان کی کھال دبیز رضائی کی طرح موٹی اور گرم ہو جاتی۔

جیسے ''ڈائنوسار'' کو زمین بوس کرنے کے لیے آسمان سے ایک چٹان گری تھی۔ یہ برف کا آخری زمانہ، دنیا سے ایک اور بڑے جسیم جانور ''میموتھ'' کو برف میں دبانے کے لیے آیا تھا۔

یہ ''میموتھ'' ہاتھی سے بھی بڑا اُسی کی شکل کا ایک دیوہیکل جانور تھا۔ یہ پہاڑ جیسے بڑے بڑے جانور برف زمانے میں گھبرا کے کپکپاتے شمال سے جنوب کی طرف دوڑے۔

بڑے جانور کی مشکل جانتی ہو؟ اُن سے تیز دوڑا نہیں جاتا۔ تم آج کے ''ڈائنوسار'' دیکھ لو۔ یہ دنیا کو بہت تیزی سے بھگاتے، دوڑاتے، کچلتے، مارتے۔

خود پکڑ میں آجائیں تو ان سے دوڑا نہیں جاتا۔

اُس زمانے کے ''میموتھ'' سے بھی دوڑا نہ گیا۔

''سائبریا'' میں برف سے ڈھکی جھیلوں

ابدال بیلا

سے ایسے کئی ''میمونتھ'' کے جسم پورے سالم محفوظ کر دیے گئے۔
برف کے اندر خدوخال بگڑنے تھوڑی تھے۔
جوں کے توں جسم مل گئے۔
ہزاروں سال پہلے کے، اُن کے جسم اسی حالت میں آج مل گئے۔ کچھ ''میمونتھ'' کے معدوں میں کھایا ہوا ہزاروں سال پرانا کھانا بھی اُسی طرح تروتازہ مل گیا۔
دیکھ یہ بہت غور کرنے والی بات ہے۔
تمہارے لیے نہیں۔
آج کے ''ڈائنوسارز'' کے لیے۔
آج کے ''میمونتھ'' نسل کے انسانوں کے لیے۔
جو ایک ایک لقمے میں پچاس گاؤں اور پورے شہر کا نصیب چٹ کر جاتے۔
ان کے معدے بھی محفوظ کر لیے جائیں گے۔
آج کے ''ڈائنوسارز'' اور ''میمونتھ'' کے لیے، اگر ''برف زمانہ'' نہ بھی آیا تو یہی ''کروناوائرس'' کافی ہے۔
جانتی یہ ایک ذرے کا دس کروڑواں حصے جتنا چھوٹا وائرس جسے مارنے پہ تل جائے، اُس کے مردہ جسم کو پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند کر کے خاموشی سے دفنا دیا جاتا۔
تمہیں پتہ، پلاسٹک کی تھیلیوں میں چھپا تابوت سال ہا سال تک محفوظ رہتا۔
پلاسٹک کے مٹی ہونے کی عمر جانتی؟
پانچ سو سال۔
''فرعون'' کو تو ''ممی'' بنا کے آنے والے دنوں کے لوگوں کو دکھانے کے لیے محفوظ کرا لیا گیا۔
اب پلاسٹک میں پیک کر کے اس عہد کے لوگوں کو، کس زمانے والوں کو دکھانا ہے۔
دیکھ
''برف زمانہ'' بھی ابھی آنا ہے۔
جیسے آج کے انسان نے اپنی ترقی کے دھوئیں، غبار اور زہر سے ہماری دنیا کے گرد ''حفاظتی حصار'' ''اوزون'' کی رضائی میں جگہ جگہ موریاں کر دیں۔
سورج کی ''انفراریڈ ریز'' ہمارے پہاڑوں کی برف کو پگھلائے جا رہی ہے۔
اوپر سے سرد موسم میں، جہاں برف نہیں بھی کبھی پڑی، وہاں پڑنے لگی، تو جان لو کہ ہم نے اپنی دھرتی ماں، اپنی ''دنیا'' کے نظام میں ایسی گڑبڑ کر دی کہ اب ہم سب ''ماحولیاتی فساد'' کی زد میں ہیں۔
تم پوچھ رہی تھی کہ آگے آنے والا رستہ بھی بتاتے جاؤ۔
تو سنو۔
تم تو ''فائیو جی'' کو جینے والی ''ہائی فائی''، ''ہائی ٹیک'' کڑی ہو۔
تمہیں پتہ، یہ انرجی کی لہریں ہیں۔ یہ نظر نہیں آتیں۔ مگر ہوتی ہیں۔ تمہارے گرداگرد کتنی قوتیں گھوم رہیں ہیں۔ ایک یہ ہماری بجلی، ہماری گاڑیاں، ہمارے ٹیلی فون، ہر موبائل

فون سروس کا اپنا کھبا، ہر کھمبے سے انرجی کے پیکٹ اچھل رہے ہیں۔
تم کیا سمجھتی۔
ہمارے ذہن کی تاروں سے یہ تاریں نہیں ٹکراتیں؟
بہت توڑ پھوڑ ہو رہی ہے۔
ابھی تو بہت اور ہونی ہے۔
تم گھر بیٹھی اڑتے چھوٹے سے "ڈرون" سے اپنے گھر کی چھت پہ اپنی مرضی کی کوئی بھی چیز دنیا کے کسی کونے سے منگوانے لگو گی۔
ممکن ہے اگلے آنے والے وقتوں میں، تم گھر کا "دروازہ" ہی گھر کی چھت بنالو۔
یہ بھی ابھی ہونا ہے کہ تم نے ایسے "جوتے" پہن لینے، جن کے اندر جیٹ انجن لگا ہو اور وہ تمہیں "پریوں" کی طرح اڑاتے پھریں۔
تم تو پری ہو "سیف الملوک" کی تلاش اور جستجو کا مرکز تمہیں راہ سی کوئی "جن" اپنے رستہ پہ لے جائے تو؟
جانتی۔ جاننے والے ہی رستہ جانتے۔
مگر تم اکثر "رستہ" اُس سے پوچھتی، جو خود اپنی راہ سے گم۔
دیکھ۔
تمہیں کہا تھا۔
رستہ اُس سے پوچھنا، جو راہ کا بھیدی ہو۔
ورنہ وہ تمہیں تمہاری منزل سے دور کر دے گا۔
ویسے "منزل" ہوتی کہاں؟
مسافرت میں جو نشہ ہے، وہ قیام میں تھوڑی۔ "قیام" کو بھی کوئی کوئی سمجھا۔
ایسے تو نہیں "اقبالؒ" فرما گئے کہ جب "قیام" کا وقت آیا تو "سجدے" میں گر گئے۔
جدھر کھڑا ہونا۔
اپنا حق مانگنا۔
غلامی قبول نہ کرنا۔
اُدھر ہم ہاتھ باندھ کے سر جھکا کے، اُن دیسی اور بدیسی حکمرانوں کے آگے لیٹ جاتے۔ اس لیے کہا، کہ ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا "قیام" کرنا۔
"سجدہ" بھی صرف ایک ہستی کے حضور بنتا ہے۔ جس نے کائنات کی تمام تر قوتوں سے ہمیں سجدہ کروایا تھا۔ یہ سمجھایا تھا کہ کائنات کی ہر شے پہ ہماری حاکمیت ہے۔ مگر ہم اپنی تاریخ کھول کے کبھی پڑھتے ہی نہیں۔
ہمارے کروڑھا لوگ، چند سو گوروں کے آگے لیٹ گئے۔
"پلاسی" کی جنگ یاد ہے۔
"دروازہ کھلتا ہے" میں اُس کی تفصیل پڑھی تم نے۔
تم ہی کو تو وہ سنائی تھی۔
ایک طرف ہمارا جواں سال گھبرو نواب سراج الدولہ، جس کے پاس پچاس ہزار پیدل اور اٹھارہ ہزار سوار تھے۔ توپیں بھی تھیں۔ میدان میں گوروں سے لڑنے نکلا۔ ساتھ کئی سو اپنی گانے اور ناچنے والی

طوائفوں کا طائفہ بھی لیتا آیا۔
رات بھر رنگ اور آہنگ کی برسات کی رم جھم میں جھومتا رہا۔ باہر بارش میں توپ خانے کا بارود سارا گیلا ہو گیا۔ اس پہ ترپال نہ ڈالی۔
حالانکہ صرف ''ترپال'' ہماری ایجاد ہے، سوتی کپڑے پہ موم مل کے ترپال بناتے تھے۔
اپنے ناچ گھر پہ ترپال تانے رکھی۔ باقی سب کچھ بھگو دیا۔
گورا نو سو گوروں اور بارہ سو ہمارے ہی کالے بندے بھرتی کر کے، اُس نواب کی پٹائی کے لیے آیا، نواب پٹ کے بھاگ گیا۔
چند سال بعد، ایک ہمارے سچ مچ کے شیر، ٹیپو سلطان کو 1799 میں اُسی گورے نے دغابازی کر کے، ہمارے ہی ''بندوں'' کو ساتھ ملا کے مار دیا۔ اُس شیر کو مارنے والے ابھی تک ہمارے بیچ رہ کے، خود کو ''فاتح میسور'' کہلواتے ہیں۔
تم کس ''برف زمانے'' کی بات چھیڑ کے بیٹھ گئی۔ ہماری تاریخ تو ایسے سرد خانوں سے بھری پڑی ہے۔
بہت سے برف زمانے گزر گئے۔
بہت ابھی باقی ہیں۔
تم کیا سمجھتی، قدرت ان سب ''ڈائنوسارز'' اور ''میمونتھ'' سے اپنا حساب بے باک نہیں کرے گی؟
دیکھ۔
قدرت وہ قوت ہے جو کسی پہ اپنا ادھار نہیں چھوڑتی۔
نسل در نسل یہ خون میں چل کر یاد رکھتی ہے۔
ہوتا یوں ہے کہ کسی کے ذمے کا ادھار اس کی پوری نسل کو اتارنا پڑ جاتا ہے۔
''انعام'' کی بھی یہی صورت ہے۔ کبھی کوئی کمپسری میں ساری حیاتی کانٹوں سے اپنا دامن بچا کے، کانٹا بن کے پانی کی ایک بوند سے ساری عمر کاٹ جاتا ہے اور انعام اُس کے کسی پوتے کے حصے آتا ہے۔
دیکھ۔
یہ قدرت نہ انعام دینے میں کنجوس ہے، نہ انتقام لینے سے ہٹتی ہے۔
آگ کی طرح یہ ہر برف عہد کا بھی عہد ہے کہ جو اپنے حصے سے زیادہ لقمے اس دنیا کے دسترخوان سے اٹھاتا ہے، اُسے ''فرعون'' کی طرح ''ممی'' بنا کے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔
کبھی ''میمونتھ'' کے کھائے ہوئے کھانے کی آنتڑیوں میں جمع بدبودار فضلے کی صورت میں۔
کبھی پلاسٹک بیگ کے تھیلوں میں دفن کر کے
اس لیے دنیا کے دسترخوان سے سوچ سمجھ کے لقمہ اٹھانا۔
پری
لقمہ لقمہ محفوظ ہو رہا۔

☆☆☆☆☆

”دوست“

گاڑی پینسلوینیا کے شہر کینٹ سکویئر سے دوکلومیٹر دور سرسبز علاقے کی طرف دوڑنے لگی۔ سڑک کے اطراف میں..... دور دور تک کوئی کوئی گھر گھنے درختوں کے بیچوں بیچ دکھائی دے رہا تھا..... وہ اپنی سہیلی ریٹا کے گھر برتھ ڈے پارٹی پر جا رہی تھی..... پینسلوینیا کے چھوٹے سے شہر کینٹ سکویئر میں اس کی رہائش تھی..... چار سو سبزے کا جال بچھا ہوا تھا..... اس نے گاڑی کا شیشہ تھوڑا سا کھولا تو خوشبو سے بھرے ہوئے ہوا کے جھونکے نے اُسے معطر کر دیا۔

وہ گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے نیچے اتری اور خوشبو میں اترتی چلی گئی۔ اس علاقے میں درختوں کی بھرمار تھی اور..... کئی رنگوں کے پھولوں سے بھرے ہوئے درخت اس کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے ایک گھنے درخت کے نیچے لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گئی..... سماں اتنا روح پرور تھا کہ وہ وہاں بیٹھنے پر مجبور ہوگئی۔ وہ جگہ رنگ برنگ پھولوں سے لدے ہوئے درختوں سے مہک رہی تھی..... سڑک پر اتنی ٹریفک نہیں تھی..... سحر نے اپنا سر بینچ کے کٹہرے سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کرلیں..... ابھی اس حسین فضا سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوئی تھی کہ قریب ہی گاڑی کے پاس زور کا جھٹکا لگا۔

یکدم سحر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

ایک گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا اور سحر کی گاڑی کے قریب ہی اس نے ..... گاڑی روک لی..... اس نے ڈگی میں دوسرا ٹائر دیکھنا چاہا تو ہوش ٹھکانے آگئے۔ وہ بھی پنکچر تھا..... اس نے پریشان حال کیفیت سے پھولوں کے درختوں کے نیچے بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا..... جو..... اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس سنسان علاقے میں کوئی بھی تو نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا..... وہ بوکھلایا ہوا..... سحر کے قریب آیا۔

میں معذرت چاہتا ہوں..... اس خوبصورت موسم میں آپ انجوائے کر رہی تھیں مگر میں.....!

بلقیس ریاض

وہ خاموش ہوگیا۔

''مگر میں'' سحر نے پوچھا۔

ٹائر پنکچر ہوگیا ہے..... شام کا وقت ہے کوئی بھی آس پاس مدد کرنے والا نہیں ہے۔

''پھر''..... سحر نے اس کی جانب دیکھا.....

فواد نے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

اگر اجازت دے دیں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں شاید کوئی یہاں سے گزرے تو میں اس سے مدد مانگ لوں۔

فواد نے اس کی جانب دیکھا..... اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ چند سیکنڈ پنکچر کا ہونا بھول گیا۔ وہ لڑکی اتنی بھلی لگ رہی تھی جو گرد و پیش کا جائزہ لے ہی تھی۔ فواد نے آج تک اس طرح کا دلکش چہرہ نہیں دیکھا تھا..... اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں پھولوں سے گھری ہوئی تھیں آپ بیٹھنا چاہتے ہیں تو بیٹھ جائیں..... شاید کوئی آپ کو منزل تک لے جائے۔

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

آپ اردو بول رہی ہیں..... مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے..... جس علاقے میں رہتا ہوں۔ وہاں سب امریکیوں کے گھر ہیں اور انگریزی بول بول کر جبڑے ہی تھک جاتے ہیں۔ شاید آپ پاکستانی ہیں۔

''جی..... میں پاکستان سے آئی ہوں۔ میری تعلیم کا آخری سال ہے۔ پھر میں اپنے وطن واپس چلی جاؤں گی۔''

''اچھا..... فواد ایک دم سے خاموش ہوگیا جیسے اس کا جانا اس پر بھاری ہو رہا تھا۔ لیکن..... انجانے میں ہی اس سے انس سا ہوگیا تھا۔ سحر نے پوچھا۔

''اور آپ''

میں تو یہاں کا سٹیزن ہوں، مگر والدین میرے بھی پاکستانی ہیں میں امریکن بینک میں جاب کرتا ہوں..... اور سال میں دو تین مرتبہ پاکستان جاتا ہوں۔

''آپ..... پاکستان میں بھی جاب کر سکتے ہیں..... یہاں ملازمت کرنے کا کیا جواز ہے۔''

''پاکستان کے حالات بڑے ہی ناگفتہ ہیں۔ یہاں اچھی جاب مل گئی ہے۔''

''اور والدین..... اکیلے ہیں۔''

میرا چھوٹا بھائی ان کے پاس ہے۔''

''اوہ''

''آپ پولیس سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔''

ضرور لے سکتا تھا مگر، جرمانہ ہونے کا ڈر بھی ہے کہ مرمت کروائے بغیر سپیئر ڈکی میں رکھی جائے تو ٹکٹ لگ جاتی ہے۔

آپ کہاں جا رہی تھیں۔

میں اپنی سہیلی کی برتھ ڈے پر جا رہی تھی..... وہاں کی پارٹی نہیں ہے بلکہ ڈنر ہے۔ وقت کافی تھا میں یہاں اس علاقے کو اپنی آنکھوں میں بند کرنا چاہتی تھی۔ بہت معذرت چاہتا ہوں..... میں نے آپ کو انجوائے نہیں کرنے دیا پھر..... شاید قسمت کو یہی منظور تھا۔

سحر نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اگر آپ کو کسی نے رائیڈ نہ دی تو میں لونگ ووڈ گارڈن کے ایریا تک لیجاسکتی ہوں۔ آپ اگر جانا چاہیں تو میں تیار ہوں لیجانے کے لیے۔

سحر کو نہ جانے اس پر رحم کیوں آ گیا تھا۔ شاید اس کی شخصیت ہی بہت پرشکوہ تھی...... کافی ہینڈسم اور مہذب انسان دکھائی دے رہا تھا۔

فواد ایک دم سے خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میری منزل بھی لونگ ووڈ گارڈن کے قریب ہے..... سحر نے حیرانی سے کہا۔

''اچھا..... پھر تو آپ آسانی سے وہاں اپنا ٹائر مرمت کروا سکتے ہیں''

''جی'' فواد نے اپنی گاڑی کو دھکا لگا کر سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور اگلی سیٹ پر وہ سحر کے قریب بیٹھ گیا۔ سحر نے اپنی پیشانی پر آئے ہوئے دراز بال اپنے ہاتھوں پیچھے کیے اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ وہ پوچھنے لگی۔

''آپ کا نام تو پوچھا نہیں ہے''

''پاکستان میں کہاں رہتے ہیں''

''لاہور''

میرے والدین وہیں لاہور میں رہتے ہیں۔

لاہور مجھے بہت پسند ہے۔

آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہ جگہ بے حد سنسان اور بے آباد تھی...... اکا دکا گھر دکھائی دے رہے تھے...... فواد کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے نہاں خانے میں جو ایک رنگین اور خوبصورت پیکر آس پاس دکھائی دیتا تھا اس میں یک دم جان پڑ گئی تھی۔

تاریک تصورات میں ایک بجلی کوندی اور وہ بے اختیار پوچھنے لگا۔

''ایجوکیشن مکمل کرنے کے بعد کیا آپ بھی یہاں جاب کریں گی''

''نہیں...... مجھے اپنے ملک میں رہنا پسند ہے اور میرے والدین شاید جاب نہ کروائیں''

فواد اس کا جواب سن کر سوچنے لگا۔ اگر اس کی شادی ہو جائے...... چند منٹوں کی رفاقت سے وہ اس کے اتنے قریب آ گیا تھا اور سوچنے لگا...... کاش......!

کیا سوچنے لگے۔

میں بتانا چاہتا تھا...... لونگ ووڈ گارڈن کے آگے جو رہائشی علاقہ ہے وہاں مجھے اتار دیں...... تو مہربانی ہو گی۔ سحر...... اپنی دھن میں گارڈن کی جانب جا رہی تھی...... جب لونگ ووڈ گارڈن کراس کیا تو فواد نے کہا۔

''تیسرے گھر میں''

''جی''

''ریٹا کے گھر میں''

اچھا...... میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ ریٹا میری کلاس فیلو ہے۔

''اوہ...... عجب اتفاق ہے...... ہماری منزل ایک ہی تھی'' فواد نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا...... اور سحر...... آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی تھوڑی سی شرما گئی۔

گاڑی پارک کرتے ہوئے وہ فواد کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو سب نے مسکراتے ہوئے دونوں کا خیر مقدم کیا۔

ریٹا...... فواد کے گلے لگتے ہوئے گویا ہوئی۔

بڑی مشکلوں سے تمہیں راضی کیا ہے..... نہ جانے، تم ہماری محفلوں کو پسند کیوں نہیں کرتے، پھر، فواد نے اسے کہا..... میری گاڑی پنکچر ہوگئی تھی۔ سحر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا..... ان کی گاڑی کی ڈکی میں پہیہ موجود ہے..... اس کا ٹائر پہلے مرمت کراؤ۔

ریٹا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ سب ہو جائے گا۔ تم پولیس کو فون کرو اور سارا معاملہ ان تک پہنچاؤ۔ ٹکٹ بچانے کے لیے گاڑی ہی پولیس کی تحویل میں چلی جائے گی بہتر ہے کہ جرمانہ ادا کر کے اپنی گاڑی محفوظ کرلو۔

فواد نے فون کر کے پولیس کو مطلع کر دیا..... سرخ و سفید رنگت کی ریٹا..... بات بات پر ہنستی اور دوستوں کے کندھوں پر جھولتی..... ریٹا کی فواد سے ملاقات ایک دوست کے گھر ہوئی تھی..... پھر اس کی شخصیت پر اتنا محو ہوئی کہ اس کا دل ہر وقت چاہتا وہ فواد کے قریب رہے..... فواد اس وقت شیشے کی وال سے ریٹا کی ماں کو دیکھ رہا تھا جو بار بار اپنے کتے کے بچے کو چوم رہی تھی..... فواد کی اس ملک میں رہتے ہوئے امریکیوں سے بھی دوستیاں تھیں مگر اس کے خمیر میں پاکستانیت کی محبت کوٹ کوٹ بھری تھی..... سحر اس کے لیے ایک انجان لڑکی تھی مگر انجانے میں وہ اس کے قریب آ رہا تھا..... چند گھنٹوں کے بعد دونوں نے جدا ہو جانا تھا، مگر فواد دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کوئی ان ہونی ہو جائے..... اور سحر کو وہ اپنا لے..... وہ سوچ رہا تھا بعض لوگ برسوں ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں مگر ان میں محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا..... لیکن اس لڑکی میں کون سی ایسی بات ہے جو میں اس کا گرویدہ ہو گیا ہوں..... وہ سب بڑے سے ہال میں بیٹھے تھے..... اور ایک طرف سوئمنگ پول کا نظارہ دیکھ سکتے تھے اور دوسری جانب سرسبز لان جس کے کناروں پر بڑے بڑے درخت کھڑے ہوا میں جھومتے ہوئے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ سامنے بڑی سی آبشار جس کا پانی تالاب میں گر رہا تھا..... ریٹا کا باپ امریکن بینک کا ہیڈ تھا..... ویرانے میں بڑا سا گھر جس میں صرف تین لوگ تھے..... ریٹا کی لاکھ اداؤں سے بھی فواد متاثر نہیں ہوا تھا، مگر اپنے ملک کی اس دوشیزہ سے چند گھنٹوں میں ہی اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ سحر نے کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھا..... وہ اسی کی جانب دیکھ رہا تھا پھر میز کے قریب کیک کاٹنے سے پہلے ریٹا نے سب کو وہاں بلوالیا تھا..... شیمپین کی بوتل کھلی تو پریشر کی وجہ سے ہوا میں اڑی اور پھر پپی برتھ ڈے کا نعرہ لگا۔ ریٹا نے موم بتیاں بجھا کر کیک کاٹا اور سب سے پہلے فواد کو پیش کیا..... وہ کھسیانہ سا ہو گیا اور سحر کی جانب دیکھنے لگا۔ پھر ویٹر شیمپین سرو کرنے لگے تو فواد نے شراب کا گلاس لینے سے انکار کر دیا تو ریٹا نے کہا۔

"تم ہمیشہ..... بہت بور کرتے ہو..... بہت بیک ورڈ ہو..... کبھی کبھی تو پی لیتے ہیں۔"

''نہیں..... ہم اس سے پرہیز کرتے ہیں۔''
فواد کی اس بات سے سحر بہت متاثر ہوئی.....
سب گپ شپ کرتے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہوئے جدا ہوئے۔
فواد کی گاڑی کا ٹائر مرمت ہو چکا تھا اور وہ سب کو الوداع کہہ کر.....سحر کی گاڑی میں بیٹھا.....اور دونوں ہی خاموش تھے۔ خاموشی کی بھی زبان ہوتی ہے۔ دونوں ہی جدا ہو رہے تھے۔ سحر ریٹا کے گھر میں فواد کو غور سے جان گئی تھی۔ اس کی شخصیت میں نکھار آ گیا تھا مگر وہ اجنبی مسافر تھا۔ وہ سوچنے لگی - ایسے مسافر کے بارے میں کیا سوچا جائے - ہاں یہ کہہ سکتی ہوں - ایک خوبصورت خواب دیکھا ہے
''سحر صاحبہ''
''ہونہہ''
''کیا ہم ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں۔''
''کیا..... میں اور دوست''۔
''فواد صاحب..... یہ ملاقات تو انجانے میں ہی ہو گئی تھی۔ میرے خیال سے دوستی میں Believe نہیں کرتی۔''
کیسی بات کرتی ہیں۔ امریکہ کی اتنی بڑی یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے۔ پاکستان سے تنہا یہاں پڑھنے کے لیے آئی ہیں اور یہاں کے کلچر میں اگر دوست نہ بنایا جائے تو اس کو Abnormal کہتے ہیں - میں نے کونسا یہاں رہنا ہے جو Abnormal کہلاؤں۔ ٹھیک ہے لیکن ہماری قدریں اجازت نہیں دیتیں - فواد صاحب میرے والدین مجھ پر بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔ اس اعتماد کے بل بوتے پر میں اکیلی پڑھنے کے لیے آ گئی ہوں اور دنیا کے کسی کونے پر بھی جاؤں گی تو اس اعتماد کو نہیں توڑوں گی۔ ہاں اگر کسی محفل میں آپ سے ملاقات ہوئی تو اخلاقاً اور رسماً سلام دعا کر لوں گی ورنہ میں دوستی کی قائل نہیں۔
فواد کو یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کا شعلہ ایک دم بھڑک کر بجھ گیا ہو۔ وہ خزاں زدہ پھول کی مانند پژمردہ نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے دل میں کتنے منصوبے بنا چکا تھا۔
فواد کو محسوس ہوا تھا جیسے ایک نہایت ہی قیمتی چیز اس کے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ پھوٹ گئی ہو۔ اور سحر ہر چند اس کی شخصیت سے مرعوب ہو گئی تھی مگر ایان اس کا ہونے والا ساتھی اس کے انتظار میں تھا۔ وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔
ایان میرا ہونے والا شوہر ہے وہی میرا دوست ہے..... یہ کہتے ہوئے اس نے فواد کی گاڑی کے قریب اسے اتار دیا۔ فواد دلبرداشتہ ہوتے ہوئے آہستگی سے بولا۔
''بہت شکریہ..... یہ ملاقات مجھے زندگی بھر یاد رہے گی۔'' سحر نے کوئی جواب نہ دیا اور اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اپنی گاڑی کے قریب پہنچا.....اور سحر ہاتھ سے ویو (Wave) کرتے ہوئے اپنی گاڑی سٹارٹ کر چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

دو نسل

جب سے میں ریٹائر ہوا ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر جیسے موذی امراض نے مجھے گھیر لیا ہے۔ ڈاکٹر کی نصیحت کے مطابق صبح وشام کی واک میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ اگرچہ زندگی بھر میں کسی بھی قسم کی ورزش سے کوسوں دور رہا ہوں۔ بس کھانا میں نے ہمیشہ سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے بھوک رکھ کے کھایا ہے۔ مرغن کھانوں کا میں بالکل بھی شوقین نہیں ہوں۔ جسم بھی میرا متناسب ہی ہے۔ پھر پتہ نہیں یہ دونوں موذی مرض کیسے چمٹ گئے۔ شروع میں سیر سے مجھے بڑی الجھن ہوتی تھی مگر اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔ ویسے بھی ریٹائرمنٹ کے بعد سیر بہترین مصروفیت ہے۔ کیونکہ ریٹائر ہونے کے بعد اکثر حضرات کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا بیکار رہنے سے زندگی ایک دم بور اور بوجھل سی لگنے لگتی ہے۔ نفسیاتی پر بندہ خود کو بے مصرف اور ناکارہ سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سوچ آدمی کو چڑچڑا اور جھگڑالو بنا دیتی ہے۔ پھر سوائے اس کے اور کوئی کام نہیں ہوتا کہ یا بات بے بات بیوی سے لڑا جائے یا ملازم پر غصہ اتارا جائے۔

میں شام کی سیر سے لوٹا تو ڈرائنگ روم سے میری بیوی کی آواز آرہی تھی۔ میری بیوی

سیما پیروز

کو اللہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ بے تکان اور اونچی آواز میں بولتی رہتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے حالانکہ جوانی میں وہ بڑے دھیمے مزاج کی خاتون تھی۔ بلکہ میں غصہ والا مشہور تھا۔ اب الٹا حساب ہو گیا ہے۔ میں اب غصہ کرنے، بے تحاشا بولنے اور بے تکی باتیں سننے سے گریز کرتا ہوں۔

جونہی وہ اپنی بیماری کا قصہ یا کسی پڑوسن کا گلہ یا پھر کسی رشتہ دار کی شکایتوں کا پٹارہ کھولتی ہے۔ میں فوراً کوئی کتاب یا اخبار کھول کر اپنے منہ کے آگے رکھ لیتا ہوں۔ وہ کچھ دیر تو مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ پھر مایوس ہو کر توپوں کا رُخ میری طرف ہو جاتا ہے۔

"توبہ ہے! یہ موئی اخبار آپ صبح سے کتنی بار چاٹیں گے۔ میں کیا بکواس کر رہی ہوں! آپ کچھ سن ہی نہیں رہے۔"

"سن تو رہا ہوں! تم بولتی رہو۔"

"میں پاگل ہوں اکیلی بولتی رہوں۔ کسی کی بات اس طرح سنتے ہیں؟ دھیان پتہ نہیں کدھر ہے۔ منہ کے آگے اخبار ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ مجھے اگنور کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا جاتا ہے۔ وہ چمک کر بولتی ہے۔

"جب تمھیں پتہ ہے تو پھر میرا سر کیوں کھاتی ہو___؟"

"آپ کے ساتھ تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" پھر وہ غصے میں بھری اُٹھ کر چلی جاتی ہے۔

اس وقت بھی میں نے سوچا کہ ہو گی کوئی پڑوسن جو اپنی بہو کی شکایتوں اور برائیوں کی پوٹلی کھول کر بیٹھی ہو گی۔ یا پھر نوکروں کے قصے ہوں گے۔ یا پھر اڑوس پڑوس میں کسی لڑکی لڑکے کے آنکھ مٹکے پر توبہ تلا کی جا رہی ہو گی۔ یا ہمارے کرایہ دار کی بیگم ہوں گی۔ اُن کی اور میری بیوی کی بہت بنتی ہے۔ شاید اس کی وجہ دونوں کی مشترکہ بیماریاں ہیں۔ وہ بھی میری بیوی کی طرح جوڑوں کے درد اور گیس کی مریضہ ہیں۔ دونوں گھنٹوں ان موضوعات پر بڑے آرام سے اور بے تکان گفتگو کر سکتی ہیں۔ مثلاً کیا چیز کھانے سے درد بڑھتا ہے اور کیا چیز کھانے سے کم ہوتا ہے۔ کونسی سبزی بادی ہے اور کون سی معتدل ہے۔ آلو کی بھجیا میں اگر میتھرے اور کلونجی ڈال لی جائے تو اس کی بادی کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چنے کی دال کو اجوائن اور زیرے کا بگھاڑ لگانے سے گیس کم ہوتی ہے۔ میں نے خاموشی سے گزرنا چاہا میں ان کی اس قسم کی باتوں سے سخت الرجک ہوں۔ مگر بیگم کے پکارنے پر مجبوراً جانا پڑا۔ وہاں ایک اجنبی صورت پر نظر پڑی۔

مجھے دیکھ کر وہ نوجوان کھڑا ہو گیا اور نہایت تپاک سے مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب تو دے دیا مگر میں اسے پہچان نہیں پایا تھا کہ وہ کون تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور وجیہہ جوان تھا۔ سرخ و سفید رنگت، ہلکی بھوری، آنکھیں، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور

چوڑے شانے۔

''پہچانو تو بھلا کون ہے۔؟'' میری بیوی کی آواز میں خوشی کے ساتھ چیلنج والی کیفیت تھی۔ میں نے لاکھ ذہن پر زور ڈالا مگر یاد نہ آسکا کہ اس نوجوان کو میں کب اور کہاں مل چکا ہوں۔

''رضی انکل میں ریحان ہوں خواجہ بشیر کا بیٹا۔ وحید کا دوست ہم آپ کے پڑوسی تھے معاً سب کچھ یاد آگیا۔

''ارے ریحان بیٹے تم! ماشاءاللہ تم تو اب پہچانے نہیں جاتے۔''

میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا اور سب کی خیریت دریافت کی۔ رات کے کھانے تک وہ ہمارے پاس ٹھہرا رہا۔ ہم لوگ مسلسل پرانی اور نئی باتیں کرتے رہے مجھے اُن سب کے بارے میں جان کر عجیب سی خوشی ہو رہی تھی۔ وہ رات کا کھانا کھا کر جہاں ٹھہرا ہوا تھا وہاں چلا گیا۔ میں نے اور میری بیوی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔

''انکل! اگر وحید یہاں ہوتا تو میں ضرور آپ کے پاس ٹھہرتا۔ اب میں نہیں چاہتا کہ آپ کو تکلیف دوں۔ ویسے میں ملنے آتا رہوں گا۔''

رات کو میں بستر پر لیٹا تو یادوں کی منڈیر پر ایک ایک کر کے دیے روشن ہوتے چلے گئے۔ ریحان کے والد خواجہ بشیر اور میں ایک ہی محلے کے رہنے والے تھے۔ ہمارا بچپن اور جوانی اکٹھے ہی گزری۔ ہم نے گلیوں میں گلی ڈنڈا اور کنچے کھیلنے سے لے کر تعلیم کے مراحل تک ایک ساتھ ہی طے کیے۔ ہم دونوں عملی زندگی میں داخل ہوئے۔ تو ہم لوگوں نے اپنے پرانے گھر بیچ کر ذرا صاف اور کھلی آبادی میں ایک ساتھ گھر بنوائے۔ دونوں گھرانوں کا اتنا میل جول اور پیار تھا کہ لوگ ہمیں بھائی سمجھتے تھے۔ ریحان اور وحید میٹرک میں تھے جب وہ لوگ اپنا گھر بار بیچ کر کینیڈا چلے گئے۔ اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ شروع میں خط و کتابت اور ٹیلیفون کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر دھیرے دھیرے بالکل ختم ہو گیا۔ فاصلے شاید دلوں میں دوریوں کو جنم دیتے ہیں اور پھر یادوں پر بھی وقت کی گرد جم کر انھیں دھندلا دیتی ہے۔ اب اتنے سالوں بعد ریحان کو دیکھ کر سارے بیتے لمحے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ میں پرانی باتیں یاد کر کے خوش ہوتا رہا۔

وحید کو میں نے ٹیلیفون پر ریحان سے ملاقات کا بتایا تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک دو روز تک فرح کو ہمارے پاس چھوڑنے آ ہی رہا تھا۔ کیونکہ اس کی یونٹ سالانہ مشقوں پر جا رہی تھی۔

دو تین روز کے بعد فرح اور وحید آ گئے۔ ان کے آتے ہی ریحان بھی اپنا سامان اٹھا کر ہمارے ہاں چلا آیا۔ وحید صرف ایک ہفتے کی چھٹی پر آیا تھا۔ یہ پورا ہفتہ اُن تینوں نے خوب انجوائے کیا۔ سارا دن ان کے قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ ریحان بچپن کی طرح

اب بھی شرارتی اور خوش طبیعت کا مالک تھا۔ بچپن کی شرارتوں سے لے کر سکھوں کے لطیفوں تک خوب نمک مرچ لگا کر سناتا تھا۔ اس کی باتوں پر میں اور میری بیوی بھی بے ساختہ ہنس پڑتے تھے۔ ورنہ اب تو مدت ہوئی ہنسی بھی کم ہی آتی تھی۔ شاید عمر کا تقاضا تھا۔ عرصے کے بعد ہمارے گھر میں اس طرح کی رونق اور ہلا گلا ہوا تھا ورنہ تو جب سے بچوں کی شادیاں ہوئی تھیں۔ ہمارا گھر سونا ہو گیا تھا۔ تینوں بیٹیاں اپنے اپنے گھر بار والی تھیں۔ دو، تو کراچی میں تھیں۔ تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی لندن میں رہتی تھی۔ وحید ہمارا اکلوتا بیٹا تھا۔ آرمی میں ہونے کی وجہ سے اس کی پوسٹنگ مختلف شہروں میں ہوتی رہتی تھی۔ ہم تو اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر اس کی ضد کے آگے ہار ماننی پڑی۔ وہ ہمیشہ ہمیں اپنے ساتھ رہنے کے لیے کہتا تھا۔ وہ جب بہت مجبور کرتا تو ہم کچھ دنوں کے لیے اس کے پاس چلے جاتے تھے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ رہنے میں آرام کے باوجود جو سکون ہمیں اپنے گھر میں ملتا تھا وہ وحید کے گھر میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بڑھاپے میں بندہ ویسے بھی پرانی چیزوں اور یادوں میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔

بچوں کی شادیوں کے بعد ہم نے کوٹھی کرائے پر چڑھا دی تھی۔ ہم میاں بیوی انیکسی میں شفٹ ہو گئے تھے ہم دونوں کے لیے یہ جگہ بھی کافی سے زیادہ تھی۔

کوٹھی کرائے پر دینے کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو ہماری بیٹیوں نے آنا ہوتا ہے۔ بیٹیاں ماں باپ کے گھر مان اور خوشی سے آتی ہیں انھیں یہ پریشانی نہیں ہوتی کہ وہ بھابی کے سر پر بوجھ ہیں۔

دوسرے ہم مالی طور پر بیٹے پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے - حالانکہ ہمارا بیٹا نہایت سعادت مند ہے - اس نے کبھی اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کی - لیکن ہمیں احساس تھا کہ اس کی گنی چنی تنخواہ میں دو گھروں کا الگ الگ خرچ چلانا مشکل ہوگا۔ کوٹھی کا کرایہ اور پنشن ملا کر ہم دونوں میاں بیوی کی ضرورت کے لیے کافی ہے۔ کرایہ داروں کی وجہ سے ہمیں تنہائی کا بھی مسئلہ نہیں ہے۔ کرایہ دار بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ وہ اور ان کے بچے آتے جاتے ہماری خبر گیری رکھتے ہیں۔ بل وغیرہ جمع کرانا ہو یا ہم میں سے کوئی بیمار پڑے تو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہماری خوراک وغیرہ کا خیال رکھنا یہ سب کام وہ حد درجہ پیار اور خلوص سے کرتے ہیں۔

وحید تو ایک ہفتے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ فرح ہمارے ساتھ ہی تھی۔ ریحان نے دوبارہ ہوٹل میں شفٹ ہونا چاہا تو ہم سب نے زبردست مخالفت کی۔ خاص طور

پروحید نے اسے بہت ڈانٹا۔

''شرم کرو! اپنا گھر ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں ٹھہرو گے۔ وہی ریحان ہو نہ! جو چوری چوری دودھ پر سے بالائی اتار کر کھا جاتے تھے۔''

ریحان جھینپ گیا۔ ''کمال کرتے ہو یار اب بھابی کے سامنے تو شرمندہ نہ کرو۔''

''اگر جانے کی ضد نہیں چھوڑو گے تو اسی طرح کی اور بھی شرمندہ کرنے والی باتیں بتاؤں گا۔''

''اچھا بابا! نہیں جاتا اب خوش ہو۔''

وہ کوئی بیس پچیس روز ہمارے ہاں رہا۔ اور یہ دن ایسے پر لگا کے اڑے کہ ہمیں احساس ہی نہ ہوا۔

آبائی پراپرٹی کا کوئی جھگڑا تھا۔ وہ احسن طریقے سے حل ہو گیا تھا۔ اب وہ واپس جا رہا تھا۔ اس کے جانے سے ہم سب بہت اداس تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا ہمارا اپنا بیٹا ہم سے جدا ہو رہا ہے۔ جاتے وقت وہ بھی ملول تھا۔ اس کے جانے کے بعد گھر میں ویرانی سی چھا گئی تھی۔ دن بھر اس کے قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ جتنی دیر وہ گھر میں رہتا کوئی نہ کوئی ہنگامہ کیے رہتا۔ اور تو اور وہ مجھے اور میری بیوی کو بھی اپنی شرارتوں میں شامل کر لیتا تھا۔ اور یہ گھر جس میں بلا گلا رہتا تھا کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

ان دنوں ہم سخت تنہائی کا شکار تھے۔ اس دوران کوئی بیٹی بھی نہیں آئی تھی۔ سب اپنے اپنے طور پر مصروف تھے۔ لندن والی بیٹی کا آنے کا پروگرام تھا لیکن عین وقت پر اس کے پروگرام میں تبدیلی ہو گئی تو اس کا آنا اگلے ماہ پر ٹل گیا۔ ہمارے کرایہ دار بھی کچھ دنوں کے لیے کراچی گئے ہوئے تھے۔ ان کے دم سے ہمیں کافی سہارا رہتا تھا۔

ایسی اداسی اور بیزاری کے موسم میں ہمیں ایک ایسی خوشخبری ملی کہ ہماری ساری اداسی بھاگ گئی۔ یہ ایسی خوشخبری تھی جس کو سننے کے لیے ہم کب سے منتظر ہے۔ دس سال کے انتظار کے بعد ہمیں کوئی دادا دادی کہنے والا آ گیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں پوتے سے نوازا تھا۔ میری بیوی پہلے تو خبر سن کر بے انتہا خوش ہوئی پھر بیٹے کو خوب لتاڑا۔

''آفرین ہے بیٹا تم پر! ماں سے یہ خبر تم لوگوں نے نو مہینے کیوں چھپا کر رکھی۔ میں کوئی تمھاری دشمن تھی۔ دعائیں مانگ مانگ کر ہونٹ بھی خشک ہو چلے تھے اور تم اب غیروں کی طرح اطلاع دے رہے ہو۔''

''کمال کرتی ہو یہ کون سا موقع ہے اس طرح کے گلے شکوے کرنے کا! لاؤ فون مجھے دو۔''

میں نے دل کی گہرائیوں سے بیٹے کو مبارک باد دی۔

وہ شرمندہ سا بولا ''ابا جان ہم آپ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ اللہ جانتا ہے یہ خبر ہم نے کس مشکل سے چھپائی ہے۔''

بیوی کا غصہ سمندر کی جھاگ تھا۔ خوشی سے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالے۔ ماں باپ ہونے کے ناطے جو مسرت ہم محسوس کر رہے ہے وہ ناقابل بیان تھی مگر میں بہو کی وجہ سے دوہری خوشی محسوس کر رہا تھا۔ فرح کے ساتھ میرا دوہرا رشتہ ہے۔ بہو کے علاوہ وہ میری بھانجی بھی ہے۔ وہ بہت ہنس مکھ اور پیاری عادت کی مالک ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے وہ خاموش سی رہنے لگی تھی۔ اولاد سے محرومی کو وہ خود بھی بہت محسوس کرتی تھی۔ اوپر سے میری بیوی اٹھتے بیٹھتے بچہ نہ ہونے کے طعنے دیا کرتی۔ ابھی تو خدا کا شکر ہے وہ مستقل ہمارے ساتھ نہیں رہتی تھی۔ پر میری بیوی کو جب بھی موقع ملتا کچوکے لگانے سے باز نہ آتی۔

”خدا جانے۔ ہم بھی کبھی وحید کے بچوں کو اپنی گود میں کھلا سکیں گے یا یہ حسرت دل میں لیے قبروں میں چلے جائیں گے۔“

وہ فرح کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی اور وہ بیچاری چور سی بن جاتی۔

”کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو۔ اللہ نے چاہا تو وہ ضرور ہماری آرزو پوری کرے گا۔“

میں فرح کی جان چھڑاتا۔

”شادی کو اتنے سال ہونے کو آئے اس کے ساتھ کے کھیلے چار چار بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے! تمھیں تو کوئی فکر نہیں۔ ہماری تو نسل ہی ختم ہو جائے گی۔' وہ رونے بیٹھ جاتی۔

”کیا بیوقوفی ہے۔“ میں جھلا جاتا۔

میرے اور وحید کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ فرح کا دل دکھانے سے باز نہیں آتی تھی۔

ایک بار تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ وہ فرح کو کسی پیر کے پاس لے کر جانا چاہتی تھی۔ اور فرح کسی صورت مان نہیں رہی تھی۔ دونوں کی تکرار نے اچھی خاصی ناگوار صورت اختیار کر لی تھی۔

”میں تمھیں ہر صورت پیر صاحب کے پاس لے کر جاؤں گی۔ ماسی جیناں بتا رہی تھی کہ ان کے دم اور تعویز سے سات سال کے بعد اس کی بھانجی کے ہاں چاند سا بیٹا پیدا ہوا ہے۔“

”ماں جی! میں ایسی جہالت کی باتوں کو نہیں مانتی۔ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر ہمارے نصیب میں اولاد ہے تو وہ ضرور دے گا، لیکن اگر مقدر میں ہی نہیں تو پھر کوئی پیر ویر کچھ نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی اگر ہمارا بچہ نہ ہوا تو کونسی قیامت آ جائے گی۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں لوگ بے اولاد ہیں۔ اور ہزاروں بچے بن ماں باپ کے ہیں۔ ہم کوئی لاوارث بچہ لے کر پال لیں گے۔“

”اللہ نہ کرے میرا بیٹا بے اولاد رہے۔“ میری بیوی چمک کر بولی۔

”ہم کیوں ایرے غیروں کے بچے پالتے پھریں۔ وہ بچہ ہمارا اپنا خون تو نہیں ہوگا نا۔

اگر تم بانجھ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم صبر کر کے بیٹھ جائیں۔ میں اپنے بیٹے کی دوسری شادی کروں گی مجھے اپنے خاندان کا وارث چاہیے۔''

فرح کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ اور وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''خبردار اجو ایک لفظ بھی زبان سے اور نکالا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ جاہل عورت! یہ پیر کیا نعوذ باللہ خدا سے بڑھ کر ہیں۔ یہ سب کمزور ایمان کی نشانیاں ہیں۔ آئندہ میں اس موضوع پر کوئی بات نہ سنوں۔''

میں نے بیوی کو جھاڑ پلائی۔

''میری تو آپ زبان بند کر سکتے ہیں مگر لوگوں کی کیسے کریں گے۔ ہر کوئی پوچھتا ہے۔ ویسے آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کی بھانجی بانجھ ہے۔'' وہ تلملا کر بولی۔

''کیوں بکواس کر رہی ہو۔ کئی دفعہ تم اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا چکی ہو۔ ڈاکٹر نے یہی کہا ہے نہ کہ بہو میں بظاہر کوئی خرابی نہیں جب اللہ کو منظور ہوگا بچہ ہو جائے گا۔''

''انھیں کیا پتہ ایسے ہی جھوٹ موٹ تسلی کے لیے کہہ دیتی ہوں گی اچھی بھلی میں اپنی بھانجی صوفیہ لا رہی تھی۔ مگر آپ نے میری ایک نہ سنی۔ اس کے ماشاء اللہ چار بچے ہیں۔ وہ میری بہو ہوتی تو آج میں بھی تین پوتوں اور ایک پوتی کی دادی کہلاتی۔ وہ رونے بیٹھ گئی۔

پھر وہی بکواس شروع کر دی۔'' میں نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ وہ غصے میں بھری اُٹھ کر چلی گئی۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھار دل میں میں بھی پریشان ہو جاتا تھا۔ اس کی باتوں کی بازگشت مجھے بھی افسردہ کر دیتی تھی۔ اگر وحید کے ہاں بچہ نہ ہوا تو کیا ہماری نسل ختم ہو جائے گی۔ اگر ہم نے وحید پر دوسری شادی کے لیے زور دیا تو کیا وہ ہماری بات مان جائے گا۔ اور پھر میری بہن اور بھانجی کی وحید کی دوسری شادی برداشت کر لیں گی۔''

وحید کے ہاں پہنچے تو ہر طرف خوشیوں کی برسات ہو رہی تھی۔ وحید کے چہرے اور در و دیوار سے بھی خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

فرح پلنگ پر تکیے کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بچہ اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ میری بیوی نے فرح کو خوب بھینچ کر پیار کیا۔ پھر وہ بے تابی سے بچے کی طرف لپکی اس نے بچے کو جی بھر کر چوما اور پھر میری گود میں ڈال دیا۔

لیجیے! آپ کو پوتا مبارک ہو۔'' خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

جونہی میں نے بچے پر نظر ڈالی مجھے یوں جھٹکا لگا جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

وہی چہرہ، ویسا ہی سرخ و سفید رنگ۔ وہی بھوری آنکھیں۔ بچہ کشمیری خون کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

☆☆☆☆☆

حکم امتناعی

اچھا خاصا ہنستا بستا محمد شفیع اپنی زمین بچانے کے لیے حکم امتناعی کا سہارا نہ لیتا تو شاید سارا گاؤں پہلے کی طرح اس کا اپنا ہی ہوتا--- اپنے باپ دادا کی زمین سے عشق میں مبتلا محمد شفیع نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ نسل در نسل تقسیم ہو کر تھوڑی سی رہ جانے والی زمین کبھی کسی موٹروے اور ہاؤسنگ سکیم کے راستے میں آجائے گی اور اسے کسی وکیل کے سہارے حکم امتناعی (سٹے آرڈر) لینا پڑ جائے گا---ایک ایسا حکم امتناعی جسے محمد شفیع نے لیا تو اپنے لیے لیکن عدالتی حکم سے کام سارے گاؤں کے ان لوگوں کا بھی رک گیا جو اپنی بنجر زمینوں کو سونے کے بھاؤ بیچنے کے خواب دیکھ رہے تھے--- محمد شفیع نہ چاہتے ہوئے بھی سب کا دشمن بن گیا-----

محمد شفیع کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی اس کے سر پر ہمیشہ ایک پرانا سا صافہ اور جسم پر ایک سفید کرتا ہوتا---دن پھر کی زمینداری اور بھینسوں کی خدمت کے معمول کے باعث اس کے لباس پر لشکارا کبھی بھی نظر نہ آتا۔ سردی ہوتی تو محمد شفیع کرتے کے اوپر ایک چھوٹی سی گرم چادر جسے گاؤں میں لوئی کہتے ہیں لے لیتا جو ہاتھ خشک کرنے ناک صاف

حبیب الرحمٰن

کرنے اور سردی سے بچانے کے لیے بھی کام آجایا کرتی - پرانے بابوں کی طرح محمد شفیع دھوتی ہی پہنتا - شلوار اس نے آخری بار بلکہ پہلی بار اپنی شادی والے دن ہی پہنی تھی - اس کے پاؤں میں ہمیشہ بشیرے موچی کا بنایا ہوا کھسہ ہوتا جو اس کے کٹے پھٹے پیروں کی حفاظت کی ناکام کوشش کرتا رہتا-

محمد شفیع کا ایک ہی بیٹا تھا جسے پڑھائی کا شوق تھا نہ زمینداری کا — دن بھر کبوتر بازی اور تاش کی بازیاں لگاتے بیٹے کو کئی سال تو محمد شفیع نے برداشت کیا لیکن آخر کار پار سال دوبئی بھیج دیا — بیٹے کو پردیس بھیج کر کہنے کو محمد شفیع کی زندگی آسان ہوگئی لیکن بڑھتی مہنگائی اور مشکل حالات کی وجہ سے اپنی محنت اور مشقت کے معمول کو نہ چھوڑ سکا — وہ دن کا اجالا ہونے سے بہت پہلے اٹھتا اور گذشتہ کئی سالوں کی طرح بھینسوں کو چارا ڈالنے اور دودھ دوہنے کے بعد فجر کی نماز کے لیے مسجد پہنچ جاتا —

شہروں میں بسنے والے شاید یہ جانتے ہی نہ ہوں کہ بارانی علاقوں میں گندم کی فصل کا انحصار اللہ کی مہربانی اور بہت سی محنت کے علاوہ بارش پر بھی ہوتا ہے - بارش ہو جائے تو فصل شاندار ہو جاتی ہے لیکن خشک سالی کی صورت میں نومبر دسمبر کے مہینوں میں فصلوں کو پانی لگا کر ہی اچھی فصل کی امید لگائی جا سکتی ہے - ٹیوب ویل سے لے کر فصلوں کے آخری کونے تک پانی پہنچانے کی مشقت کا احساس صرف بارانی علاقے کا کسان ہی کر سکتا ہے - اگر آپ شہر میں پیدا ہوئے ہیں اور آپ نے زندگی بھر پسا ہوا آٹا اور بوریوں میں بند گندم ہی دیکھی ہے تو آپ کو اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ نومبر دسمبر کے مہینوں میں جب شہروں میں ہیٹر کے پاس بیٹھ کر ڈرائی فروٹ کھائے جا رہے ہوتے ہیں، بارانی علاقے کے گاؤں کا کسان دھند آلود سرد راتوں میں گندم کی فصل کو پانی لگانے کی مشقت اٹھا رہا ہوتا ہے-

ایسی ہی ایک شام جب سارا گاؤں سردی اور دھند کے باعث لحافوں گھسا ہوا تھا محمد شفیع ٹیوب ویل سے آنے والے پانی کو دور دراز کھیتوں تک پہنچانے کے لیے سردی میں ہانپتا کانپتا کیچڑ میں لت پت اپنے کام میں مصروف تھا - اس کے کھردرے ہاتھوں میں کدال اور لالٹین موجود تھی جس کی مدھم روشنی میں وہ پیٹر انجن سے چلنے والے ٹیوب ویل سے آنے والے پانی کو باریک بینی سے دیکھ رہا تھا - کھالوں سے آنے والے پانی کو کیاروں تک لانے اور بار بار ٹوٹنے والے پانی کو کدال سے سیدھا کرتے وہ بہت تھک چکا تھا - بجائی کے بعد اگر ایک بار بھی بارش ہوگئی ہوتی تو وہ شاید اتنی مشقت نہ اٹھا رہا ہوتا لیکن اس سال ہونے والی خشک سالی نے اسے پانی لگانے پر مجبور کر دیا تھا - ڈیزل سے چلنے والے پیٹر انجن کا کرایہ

دو ہزار روپے فی گھنٹہ کا سوچتے کھاد، یوریا اور بیجوں کی قیمت کا حساب لگاتے ہوئے محمد شفیع کڑھتا بھی رہا اور اور دھند کے درمیان ہر کھیت کے آخری کونے تک پانی پہنچانے کی کوشش جاری رکھتا رہا۔ شدید تھکن کے باعث رات کے پہلے پہر جب اس نے باقی کام کل پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو ابھی کچھ کھیتوں میں پانی لگانے کا کام رہتا تھا۔ تازہ پانی سے پاؤں دھونے اور، پیٹر انجن کو بند کرانے کے بعد اس کی اگلی منزل قریبی حویلی تھی جہاں بندھی اس کی ایک بھینس پچھلے کچھ دنوں سے بیمار تھی۔ پرانی بوریوں سے بنے پردوں کے پار مشکل سے سانس لیتی ہوئی بھینس کو دیکھ کر اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ باقی ڈنگروں کو چارہ ڈالنے کے بعد اس نے بیمار بھینس کو بانس کی نلی سے اسے دوا دینے کی کوشش کرتے ہوئے اللہ سے بھینس کی صحت کے لیے کئی بار دعا کی۔ قریب کہیں مویشیوں کا ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے وہ بلکہ سارا گاؤں ہی دیسی ٹوٹکوں اور دعا سے کام چلانے کی کوشش کیا کرتا۔ علاقے کے ایک پیر صاحب ہر سال جانوروں کی صحت اور بارش کی دعا کے لیے گاؤں آتے جس کے لیے تمام جانوروں کا اکٹھا کیا جاتا لیکن دعاؤں کے باوجود اس سال بارش بھی نہ ہوئی اور محمد شفیع کی بھینس بھی بیمار بھی ہو گئی۔۔۔۔۔۔

کیا حال ہے بھینس کا۔۔۔ گھر پہنچنے پر دروازے کے کھڑکار سے اٹھ جانے والی اس کی بیوی اسے خوش آمدید کہتے ہوئے بولی

ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ محمد شفیع نے تھکن زدہ لہجے میں جواب دیا۔۔۔

جیراں خاموش رہی اور زیر لب کوئی وظیفہ پڑھتی ہوئی اس کے لیے چنگیر میں روٹی اچار اور دودھ کا پیالہ لے کر آ گئی۔۔۔

کیا بنے گا۔۔۔ وہ ٹھنڈی ہوتی ہوئی انگیٹھی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔۔۔

محمد شفیع نے کوئی جواب نہ دیا اور ٹھنڈی ہوتی ہوئی اور انگیٹھی کے پاس ہی پڑے چمٹے سے راکھ کو کریدنے لگا

جیراں چاہتے ہوئے بھی اسے نہ بتا سکی کہ گاؤں کے تمام لوگ اس سے ناراض ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ حکم امتناعی واپس کرا لے۔۔۔ اسے اندازہ تھا کہ محمد شفیع کے لیے بات زمین کے ایک ٹکڑے کی نہیں۔ زندگی اور موت کی ہے۔۔۔

صبح پنچایت میں بلایا ہے آپ کو نمبردار نے۔۔۔ کھانا کھا کر بستر کی طرف جاتے ہوئے محمد شفیع کو جیراں نے بتایا۔۔ محمد شفیع نے کوئی جواب نہ دیا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔۔۔ لاحاصل محسوس ہوتی ہوئی اتنی محنت مشقت کے باوجود اس کا دل زمین کو موٹروے اور ہاؤسنگ سکیم کی نذر کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

پچھلے دنوں سے کتنی ہی بار شہر اور ملک چھوڑ کے جانے والے اس کے قریبی عزیز اسے سمجھا چکے تھے کہ کہ اب زمینداری میں کچھ نہیں پڑا۔ زمین کے اچھے مول مل جائیں تو اس سے نئی زمین لے کر پھر سے مٹی کی محبت کا مان رکھا جا سکتا ہے۔۔۔ مگر اس پر تو ایک ہی بھوت سوار تھا کہ کوئی تو ہو جو باپ دادا کا کام جاری رکھے کوئی تو ہو جو زمینیں سنبھالی رکھے ۔۔۔۔وہ گاؤں چھوڑ کر جانے والوں سے الجھتا اور پھر دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیتا۔۔۔

محمد شفیع رضائی میں سر دے کر گزرے دنوں کو یاد کرنے اور صبح کی پنچائیت میں اپنے موقف کے بارے میں سوچنے لگا۔ پچھلے کئی ماہ سے دنیا بھر کے قصے زیر بحث لانے والے گاؤں کے پرانے بابے اب مایے اور داستانیں نہ سناتے بلکہ بجلی کے بلوں، گندم کے نرخوں اور مہنگائی کے بڑھتے اخراجات کی باتیں کرتے ۔۔۔ پچھلے کچھ عرصے سے علاقے کے لوگوں کی باتیں غیبتوں قیمتوں سے ہوتی ہوئی زمینوں سے حاصل ہونے والی فصلوں کی گھٹتی آمدن اور علاقے کی زمینوں پر نئی بننے والی ہاؤسنگ سوسائٹی اور علاقے سے گزرنے والی موٹروے کے منصوبے تک محدود ہو گئی تھیں۔ ان سب کے خیال میں موٹروے اور ہاؤسنگ سوسائٹی کا منصوبہ اللہ کی رحمت بن کر آیا ہے جس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ محمد شفیع کا حکم امتناعی ہے۔۔ مہنگائی اور موٹروے سے ہوتی ہوئی بحث ہمیشہ محمد شفیع پر ختم ہوتی جو اپنا سٹے آرڈر واپس لینے کو بھی تیار نہ تھا اور نہ ہی ہار ماننا چاہتا تھا ۔۔ مشکل حالات کے باوجود باپ دادا کی زمین کو سیمنٹ سریے اور بجری تلے روندنے کے خیال سے ہی اس کی جان سلگنے لگتی۔

اگلی صبح کی پنچائیت بھی ایسے ہی افلاطونوں سے بھری پڑی تھی۔۔

مجھے نہیں دینی اپنی زمین کسی بھی ایسے منصوبے کے لیے ۔۔۔۔اس نے مصمم ارادے سے کہا تو سارا گاؤں چڑ گیا۔۔

خود بھی بھوکا مرے گا اور ہمیں بھی چین سے زندگی نہ گزارنے دے گا۔۔اس کے رشتے دار اسے جھلا سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ۔۔

تو زمین سے اتنا سو سال میں نہیں کما سکتا جتنا تیری زمین کچھ عرصے میں تجھے دینے والی ہے ۔۔۔چوہدری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی

دینے والی نہیں ۔۔۔زمین کی دلالی سے پیسے حاصل کرنے کا ایک منصوبہ ہے جو تم سارے مل کر بنا رہے ہو۔۔وہ چڑ کر بولا

چوہدری نے جانے اس کا جواب کیسے برداشت کیا اور جانے کیسے گالی دیتے وہ چپ ہو گیا ۔۔۔۔۔۔۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی زمین نہ دینا چاہوں اور کوئی زبردستی سے آ کے قبضہ کر

لے --- وہ ایک بار پھر گویا ہوا
سرکار کے پاس سو طریقے ہوتے ہیں
--- تو اگر تعاون نہیں کرے گا تو سارے
گاؤں کا نقصان کرے گا --- فیکا کمہار
سارے گاؤں کی ترجمانی کرتے ہوئے بولا
ہو تا رہے --- محمد شفیع نے مستحکم لہجے میں کہا
-- مجھے اپنی دھرتی نہیں بیچنی اور نہ ہی اللہ کی
طرف سے کاشتکاری کے لیے دی ہوئی
زمین سیمنٹ بجری سے ویران کرنی ہے ---
اور نہ ہی مجھے سٹے آرڈر واپس لینا ہے ---
وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا ---
تو اچھا نہیں کر رہا ہمارے ساتھ --- گاؤں
کے نمبردار نے اپنا شدید غصہ دباتے ہوئے
ایک بار پھر بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا
اچھا تو آپ سب نہیں کر رہے --- اس کا
لہجہ اب تک نرم نہیں ہوا تھا --- دھرتی ماں کا
سودا کر رہے ہیں لہلہاتی فصلوں اور سبزہ
زاروں کو سیمنٹ اور بجری کے قبرستان میں
دفن کر رہے ہیں۔
تیرا بیٹا دوبئی ہے تیرا گزارا ہو جاتا ہے
--- گاؤں کے لوگوں کا نہیں ہوتا ---
نمبردار اسے سمجھاتے ہوئے بولا ---
حکومت نے جب زمین لینی ہوگی تو تیری
ہاں یا ناں نہیں پوچھنی --- اس کے چاچے
کے بیٹے نے اسے سمجھانے کی ناکام کوشش
کرتے ہوئے کہا
کیوں نہیں پوچھنی محمد شفیع چڑ کر بولا ---
میرے ہوتے ہوئے تو ایسا ہونا نہیں میرے
مرنے کے بعد جو جی چاہے کرتے رہنا
بہت سی زمین تیرے اکیلے کی نہیں ہے
--- چاچے کا بیٹا بھی چڑ کر زور سے بولا ---
سانجھی زمین ہے --- مرلہ دو مرلہ جو تیرے
نام وکھ (علیحدہ) ہوگی اس پر اس پر اکڑ بھی
لینا اور لڑ مر بھی لینا ---
دیکھی جائے گی --- محمد شفیع غصے سے کدال
اٹھائی اور پنچائیت چھوڑ کر حویلی سے باہر
نکل گیا۔
دھرتی ماں ہوتی ہے --- محمد شفیع نے اپنے
مرحوم باپ کے کہے لفظ زیرلب دہرائے
اور کھیتوں کی جانب جاتے ہوئے والد کی
بات کو یاد کرنے لگا جو اکثر کہا کرتے تھے کہ
دھرتی ماں ہوتی ہے اور ماں اپنے بچوں کو
کبھی بھوکا نہیں مرنے دیتی --- محمد شفیع کی
اگلی منزل گاؤں سے قدرے دور باقی رہ
جانے والے وہ کھیت تھے جہاں تک وہ
گزشتہ رات پانی نہیں پہنچا سکا تھا --- پیٹر
انجن چلوا کر وہ کدال سے پانی کے راستے کو
ہموار کرتے اور ہر کیارے میں پانی لگاتے
آخری کھیت تک پہنچا تو شام کے سائے
پھیلنے شروع ہو چکے تھے۔ دن میں نظر آنے
والی ہلکی ہلکی دھند قدرے دبیز ہو چکی تھی۔
سردی اور بھوک سے نڈھال محمد شفیع نے
اندھیرا پھیلنے پر لالٹین جلا تو لی لیکن شدید
دھند اور اندھیرے کے باعث اسے آج
بھی کام مکمل کرنا مشکل ہی لگ رہا تھا ---
دوسری طرف گھر بیٹھی حیران کتنی ہی

دیر اس کے پنچائیت سے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی۔ دوپہر میں تندور پر روٹیاں لگاتے ماسی صادقاں نے جب اسے پنچائیت کی کارروائی بتائی تو اسے کچھ اطمینان ہوا کہ محمد شفیع خیریت سے ہے اور کھیتوں میں پانی لگانے کے لیے گیا ہوا ہے۔۔۔۔ کھیت کھلیان میں کام کاج کے باوجود عام طور پر محمد شفیع دوپہر کو گھر کا چکر لگا لیا کرتا اور جیراں کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد ڈھور ڈنگر کی خیر خبر لیتے ہوئے واپسی کی راہ لیتا۔۔۔ شام تک محمد شفیع نے گھر چکر نہ لگایا تو آخر کار جیراں کا صبر جواب دے گیا اور اس نے ہمسائے میں بیاہی اپنی بہن مسرت سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔۔۔۔۔ مسرت کا میاں زمینداری کا جھنجھٹ چھوڑ کر قریبی قصبے میں ایک دکان کرتا تھا اور ابھی کچھ ہی دیر پہلے گھر پہنچا تھا۔ بہن نے جیراں کو دم دلاسہ دیا اور اپنے میاں کو محمد شفیع کی خیر خبر لینے کا کہا۔ مسرت کا میاں جب گھر سے نکلا تو عشاء کی بانگ ہو رہی تھی اور شدید دھند کے باعث دروازے کے باہر کچھ نظر نہ آتا تھا۔۔۔۔

جانے پہچانے راستوں پر چلتے مسرت کے میاں کی پہلی منزل قریبی حویلی تھی جس میں محمد شفیع کی بیار بھینس بندھی ہوئی تھی۔۔۔ اس نے دھند میں لپٹی حویلی کے کونوں کھدروں میں محمد شفیع کو ڈھونڈتے ہوئے کئی بار آواز دی لیکن کوئی جواب نہ پا کر کھیتوں کی راہ لے لی۔ اس کی اگلی منزل قریب ہی بنی ڈیزل سے چلنے والے ٹیوب ویل کی کوٹھڑی تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ڈیزل ختم ہو جانے کے باعث ٹیوب ویل جانے کب کا بند ہو چکا تھا۔ اس نے محمد شفیع کو ایک دو بار پکارنے کے بعد کھیتوں کی راہ لی لیکن شدید دھند کے باعث اس کے لیے اس سے آگے دو قدم بھی چلنا محال ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود ٹارچ کی روشنی بھی ایک دائرے کی شکل بنا کر دھند میں ہی گم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس نے اندازے سے کیچڑ سے اٹے پانی کے راستے پر چلنا شروع کیا اور ایک ایک کر کھیتوں کے تمام کیارے دیکھ لیے۔ خوف ٹھنڈ اور مایوسی سے زیادہ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ گھر جا کر بہن جیراں کو کیا جواب دے گا۔ آخری کھیت کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے پلٹنے کا سوچا اور ٹارچ کی روشنی میں چاروں جانب دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے شائبہ سا ہوا کہ کھیت کے کنارے پر کوئی اوندھا گرا ہوا ہے۔ اس نے محمد شفیع کو آواز دیتے ہوئے کھیت کے کنارے تک پہنچنے کے لیے قدم اٹھایا لیکن پیروں میں آنے والی بھجی لالٹین سے ٹکرا کر وہ خود زمین پر ڈھے گیا

☆☆☆☆☆

دوشِ ہوا کے چراغ

سَر جھکائے نگاہوں کا سلسلہ زمین سے جوڑے ہوئے میں آہستہ آہستہ قبرستان سے نکل کر زندہ آدمیوں کے شہر میں آ گیا اور مجھے یوں لگا جیسے کہیں کچھ نہیں ہوا بس ایک آج ختم ہو گیا تھا زندگی اور زندگی کے ہنگامے وہی تھے لوگ مرنے والے کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔

بڑا شریف آدمی تھا۔ محنتی بھی تھا۔ اجی قانون تو اُس کی رگ رگ میں گویا بسا ہوا تھا۔ بڑا قابل مخلص اور نہ جانے کیا کیا۔

میں نے ایک لمحہ کو سامنے رکھ کر اُس سے پوچھا۔ کیا واقعی لوگ مرنے کے بعد اس قدر شریف بن جاتے ہیں کہ پیغمبر ہونے کا گماں گزرے۔ ہم زندگی بھر اپنے مفادات کے تحت اُس کی کتنی تذلیل یا تکریم کرتے ہیں - پوری زندگی کچھ لوگوں کی تلخ ترش باتیں کرنے کہنے میں گزر جاتی ہیں اور جب کان کچھ سن نہیں سکتے اور آنکھیں کچھ دیکھ نہیں پاتیں اور جسم حرکت نہیں کر سکتا زبان جواب نہیں دے سکتی تو کہا جاتا ہے بہت شریف آدمی تھا مخلص ہمدرد اور اکثر ایسا ہوتا ہے اور نہ جانے کب تک ہوتا ہے لیکن مرنے والے کو میں بہت قریب سے جانتا ہوں اتنے قریب سے جس طرح دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو پہچانتا ہے۔

آج وہ مر گیا تھا میں قبرستان میں اُسے دفن ہوتے دیکھتا رہا شاید اُس کے ساتھ اُس کی ہر برائی دفن ہو گئی تھی یا شاید اُس میں کوئی برائی نہ تھی برائی صرف زندہ رہنے میں ہوتی ہے بہرحال کچھ ہوتا ضرور ہے اس لیے لوگ سب کچھ بھول کر اُس کی تعریف کرتے ہیں مگر میں یہ فلسفہ آج تک سمجھ نہیں پایا حارث وکیل تھا شاید کئی دلیل دے کر مطمئن کر دیتا مگر یہ مجھے کیا ہوا ہے میرے پاؤں کی کیوں جان سی نکلی جا رہی ہے میں نے بوجھل بوجھل سانسوں کو درست کرتے ہوئے سوچا۔

آپ نے شاید وکیل صاحب کا نوکر نہیں

اقبال خان یوسف زئی

دیکھا وہی جو حارث کی بیٹی کی شادی میں دُھلی ہوئی شلوار قمیض اور ملگجی سی واسکٹ پہنے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا حسرت بھری نگاہوں سے زبان پر چپ کا ایک بھاری قفل لگائے ہر آنے جانے والے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اُسے اُس کا کھویا ہوا بیٹا مل جائے گا جو وکیل بن کر کہیں کھو گیا تھا اور جس نے باپ سے کہا تھا اگر شادی میں شریک ہونا ہے تو پوچھنے پر یہی بتانا کہ میں وکیل صاحب کا نوکر ہوں۔

حارث بڑا شریف آدمی تھا۔ شریف نہ ہوتا تو باپ کو نوکر کیسے بتاتا۔ وقت کی نگاہوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے بہت پیچھے مڑ کر اُس لمحہ کو آواز دی جہاں لمحہ محض لمحہ نہیں ہوتا۔ پوری کائنات ہوتا ہے پوری زندگی ہوتا ہے۔ توانائی اور حرکت سے بھرپور، زندگی اور زندگی کی تمناؤں سے معمور___

اس لمحے کو میں نے اپنی آنکھوں میں بسا لیا۔ وہ لمحہ ان دیکھے وقت کی طرح میرے دل میں ابھی تک یوں بسا ہوا ہے جیسے بادلوں میں پانی، پھول میں خوشبو اور دل میں خواہش ہوتی ہے۔ یہ لمحہ جو گل کی محبت سے عبارت ہے میری گل کائنات ہے میری زندگی کا حاصل ہے۔

میں نے گل کو پہلی بار دلہن کے روپ میں دیکھا تھا، چاندنی اُس کے چہرے پر کھلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں جادو ان چھوئی کلیوں کی مستی ہونٹوں پر سلگتا سا گداز گالوں پر حیا کی سُرخی تھی راتیں اُس کے گیسوؤں میں سوتی دن اس کے شباب کی سرمستی میں کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔

یونہی سرسبز درختوں کے سائے میں چلتا ہوا ڈھلتا ہوا وقت میں گل کا ہاتھ اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لیتا ہوں کہیں وہ بھی میری رسائی میری پہنچ سے دور نہ ہو جائے کسی درخت سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح جو ہوا کے دوش پر چلتے بہتے ہوئے میرے قدموں تلے دب کر ایک آواز کے ساتھ میری جانب حیرت سے دیکھتا ہے۔ میں ایک لحظہ اُس کی آواز کو سنتا ہوں پھر گل کے ہاتھ کو ہولے سے دباتے ہوئے کہتا ہوں۔ کاش بہتے ہوئے وقت کو روکنے تھامنے کی کوئی راہ نکل آئے اور ہم دونوں یوں ہی چلتے رہیں، چلتے رہیں۔

گل میرے ہاتھ کی گرفت سے میرے دل کے اندر کی بات پا لیتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا، ہم دنیا سے الگ ایک دنیا سوچ تو سکتے ہیں مگر بنا نہیں سکتے۔ قدرت کا اپنا نظام اپنا انتظام ہے۔ میں نے گل کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک دن ایسا وقت بھی تو آ سکتا ہے جب ہم وقت کی گرفت میں جکڑے ہوئے اپنے بکھرے یوں بکھرے چہرے کو دیکھیں تو خود کو پہچانے ہوئے پہچان نہ پائیں۔

گل نے بہت بے چین ہو کر کہا۔ مگر کون جانے ایسا وقت آئے کہ نہ آئے، ہم

کسی قاتل لمحے میں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

نہیں گل ___ ایسا نہ کہو ایسا نہ سوچو

گل کے چہرے پر ایک مہین سی مسکراہٹ آئی اور معدوم ہو گئی۔ پھر وہ کہنے لگی۔ دیکھو یہ جو زندگی ہے نہ یہ ہماری خواہش کے مطابق تو نہیں رہتی۔ کون جانے آنے والا کل ہماری زندگی میں آئے گا بھی یا نہیں۔ میں جب تم سے جدا ہونے کا تصور بھی کرتی ہوں تو دل میں کہیں بہت گہرے اندر اُتھل پتھل سی ہونے لگتی ہے۔ پھر میرے دل سے۔ بس یہی آواز آتی ہے تم سلامت رہو، ہمیشہ خوش رہو۔ اور دیکھو کبھی میری زندگی میں بوڑھے نہ ہونا ___

گل اب تم بھی میری طرح جذباتی باتیں کرنے لگی ہو۔ تم تو بہت حقیقت پسند ہو۔ گل نے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا۔ وہ دن میری زندگی کا آخری دن لگتا تھا۔ گل جو وجہ زندگی تھی میری کائنات تھی۔ وہ جو میرے ماتھے کی شکن سے میرے دل کا حال جان لیتی تھی۔ میرا اُداس چہرہ دیکھ کر اتنا بے چین ہو جاتی کہ میں اپنی اُس پریشانی کو بھول جاتا تھا وہ ایک بچے کو جنم دے کر زچگی میں مر گئی۔ چار سال کی رفاقت کا یہی وہ زخم تھا جسے میں اُس ننھی سی جان کو ملک تقسیم ہونے پر انسان نما درندوں اور وحشیوں کی نگاہوں سے بچا کر یہاں آ گیا اپنی جوانی میں نے اپنے بیٹے کو سونپ دی۔

وہ جوانی کی حدود میں داخل ہوا اِدھر میرے بالوں میں سفیدی یوں دھیرے دھیرے گھلنے لگی جیسے رات ہولے ہولے صبح کی منزل کی جانب بڑھے۔ آنکھوں کے رستے سارے ہی غم بہہ گئے شاید یہ بھی سمجھوتے کی ایک شکل ہے غم کے ساتھ۔

بیٹا بی اے ہو گیا سرکاری ملازم بھی ہو گیا اور میری توانائی پر بڑھاپے نے یوں قبضہ جما لیا جیسے کوئی زور آور کسی کے مال و دولت پر قبضہ جما لیتا ہے۔ اُس وقت گل کا یہ کہنا ___ ''دیکھو کبھی میری زندگی میں بوڑھے نہ ہونا۔'' مجھے بہت یاد آتا ہے بہت تڑپاتا ہے۔ کیا اُسے اِس کا بھی ادراک تھا کہ وہ عمر کے اس حصے میں میرے ساتھ نہ ہو گی سوچتا ہوں تو سوچتا ہی چلا جاتا ہوں۔ کسی پر بھی بڑھاپا اُس کی مرضی سے تو نہیں آتا یہ تو زندگی کا عمل ہے۔ وہی عمل جو بچے کو نوکری سے نکال کر جوانی کی طرف اور جوانی، بڑھاپے کی طرف لے جاتی ہے پھر ایک ایسا وقت تو ضرور آتا ہے جب وہ پھر کسی کی توجہ چاہتا ہے نگہبان آنکھیں اور مہربان ہاتھ چاہتا ہے۔

سوچتا ہوں کاش زندگی کے اِس آخری حصے میں بھی ہم ساتھ ہوتے۔ ہم نے ایک دوسرے کو پانے کے بعد کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ ایک مسکراتی صبح کے ایک مسکراتی زندگی کے اُس ایک لمحۂ آخر میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک

دوسرے کو الوداع کہتے اپنی آنکھیں موند لیتے سو جاتے سو کر کبھی نہ اُٹھنے کے لیے___ زندگی کی جانب الوداعی ہاتھ لاتے ہوئے نہ ختم ہونے والی زندگی کی طرف جاتے ہوئے___ کبھی سوچا نہ تھا کہ تمام عمر کی ریاضت محنت کا صلہ اپنوں پر بوجھ بن کر رہ جائے گا۔

پھر___ ایک روز بیٹا اپنی ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی آمدنی کے واقعات اپنی بیوی کو یوں سنا رہا تھا جیسے کوئی حریص بوڑھا اپنی جوانی کی رنگینیوں کے قصے چٹخارے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ میں اُسی دن اُس شہر کو چھوڑ کو ایک دوسرے شہر میں محنت مشقت کرنے لگا ابھی میرے بازوؤں میں اتنا دم خم تھا کہ رزق حلال کما سکیں۔

بہت دنوں کے بعد معلوم ہوا اُس نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا ہے اور وہ اب پریکٹس کر رہا ہے۔ میں باپ کا مجبور دل لے کر مبارک باد دیکر چلا آیا۔ اُس نے مجھے اپنے پاس ٹھہرنے کے لیے کہا۔ پھر شاید وہ مزید اصرار کرتا مگر بیوی کے گھورنے پر خاموش ہوگیا۔

اور جب اِس دنیا نے میری محنت کا عرق خوب اچھی طرح نچوڑ لیا اُلٹ کر پلٹ کر___ جیسے بیلنے میں گنے کا رس نکالا جاتا ہے اُلٹ کر پلٹ کر مروڑ کر:

میں اپنی بہو کے ماتھے پر پڑی ناگواری کی لکیریں گننے پر مجبور ہو گیا اب میرے بازوؤں میں وہ طاقت نہ تھی پاؤں میں وہ قوت نہ تھی کہ جسم کا بوجھ سہار سکیں ہاتھوں میں ضعف بصارت کمزور لیکن بیٹا اور بہو اب بھی ہر ممکن کوشش کرتے کہ میری رگوں میں بچے کھچے خون کے آخری قطرے سے لے کر بصارت کی آخری کرن تک کام لیتے رہیں۔

اور آج جب وہ اپنے بیٹے کو دفن کرنے کے بعد زندہ آدمیوں کے درمیان آیا ہو تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے زندہ رہنے کا حق بھی ہے یا نہیں مگر شاید موت پر بھی میرا اختیار نہیں زندگی کی طرح بیٹے کے گھر سے میرا تعلق ختم ہو چکا ہے میں جانتا ہوں میری بہو مجھے ایک دن بھی اپنے پاس نہ رکھے گی۔ اس لیے:

آؤ: اور اُٹھا کر پھینک دو مجھے اور مجھ جیسے تمام بوڑھوں کو کوہ ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی سے زمین کی طرف یا پھانسی سے لٹکا دو کہ اُن کا جرم یہی ہے کہ وہ بوڑھے ہیں اُن کا کوئی سہارا نہیں تمھاری مشینی زندگی کو اب ایک نئے پرزے کی ضرورت ہے جو اِس سماج اور معاشرے کے احکامات برق رفتاری سے انجام دے سکے یا پھر اِس معاشرہ کو بدل دو جہاں تمام عمر کی جدوجہد کا صلہ حسرت و نامرادی اور یاس ہے جہاں تم بڑھاپے کو کوڑھ سمجھتے ہو اُسے معاشرے کا ناسور سمجھتے ہو۔ اس ناسور کا علاج کرو۔ یا پھر۔ وہ تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆

ضدی

کبھی کبھی مدتوں میں گزری ہوئی زندگی ایک لمحے میں ڈھل جاتی ہے۔ بالکل ایک زندہ لمحے میں اور یوں لگتا ہے ہم تو بس یہیں کھڑے تھے۔ کسی کی یاد کے ممبر پر کھڑے رہے اور وقت انتظار بن کر منجمد ہو گیا تھا۔ پھر جسم پر وقت، عرصہ، مدتیں گزرتی رہیں۔ مگر وہ قیمتی لمحہ تو بس کہیں رہ گیا تھا۔ ویسے تو وہ سب کچھ سمیٹ کر یاد کے اس حسین جزیرے سے رُخصت ہوئی تھی۔ تب خوابناک آنکھوں میں خوابوں کے جھولے گول گول گھومتے تھے۔ دل کے آسمان پر پہنچنے والے خیالات زمین پر کب آتے تھے۔ لمحے لمحوں سے گلے مل کر اُس کے چہرے کا ڈمپل بن جاتے۔ سُرمئی گھنی آنکھوں میں کئی رنگ مچلتے۔

جب ایک دن اچانک ہی کسی نے کہا تھا۔ سمجھ نہیں آتا تمھاری آنکھوں کا رنگ کیا ہے؟ خوبصورت اور پُرکشش ہیں مگر کبھی ان پر غور کرنے کا موقع دیجئے۔ اور وہ ''اپالو'' کے اس مجسمے کو دیکھتی رہ گئی۔ اُسے ہرگز اس بات کی توقع نہیں تھی کہ پتھر کا بُت کبھی بولے گا۔ اُس نے غور سے اُسے دیکھا۔ کیا یہ وہی ہے جو لفظوں کو اتنی کنجوسی سے استعمال کرتا ہے کہ مانو گویا لفظ بولنے پہ ٹیکس لگتا ہے۔ اچھا جناب۔ اب مردے بھی بولنے لگے۔ سمعیہ نے پوچھا۔ جب کوئی اچانک ہی زندگی بن کر آئے تو یہ ممکن ہو جاتا ہے۔ جنید کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھلی۔ یہی مسکراہٹ تھی جسے وہ دیکھنے کے لئے بھائی سے کہتی کہ کوئی لطیفہ سُنائیں۔ کوئی مزاحیہ بات کریں۔ اِس پتھر چہرے میں زندگی کے آثار پیدا ہوں۔ اور آج بغیر کسی وجہ کے۔ یا اللہ خیر۔ پتھر میں جونک کیسے لگی۔ لمحے گرفت میں کیسے آئے۔ کوئی قطبی ستارا کب گزرا۔ قسمت پلٹتے دیر نہیں لگی تھی۔ اُس نے جلدی سے ڈوپٹہ سیدھا کیا اور کمرے میں بھاگ گئی۔ جنید کی بدلی ہوئی شخصیت پر سوچنا چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں مچلتے کسی اَن دیکھی مُسکان کے رنگ اُسے پریشان کر رہے تھے۔ ایسا کیا ہوا تھا۔ کب ہوا تھا۔ وہ لمحوں کو رول بیک کر کے اندازہ لگانا چاہتی تھی۔

فیملی کی تقریباً سبھی لڑکیاں اُس پر قربان ہو

آسناتھ کنول

ہو کر مایوس ہو چکی تھیں اور تھک ہار کر شادیاں کروا کر اپنے اپنے گھروں میں شاد و آباد تھیں - جنید ملک - ملکوں کے خاندان کا چہرہ مہرہ- جسے ویسے ہی تعریفوں نے ساتویں آسمان پر بٹھا رکھا تھا- سمعیہ ذرا چھوٹی تھی- لہٰذا اُس نے ایسا کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا- اپنی پڑھائی میں مگن، ذہین طالب علم، جنید بے شک تایا زاد تھا- مگر جنید کی کچھ سخت اور مغرور طبیعت کی وجہ سے سب اُس سے دُور ہی رہتے- صرف آذر بھائی سے دوستی کی وجہ سے وہ سمعیہ کے گھر آتا جاتا رہتا-

خاندان والوں نے مایوس ہو کر اپنی اپنی بیٹیوں کی شادیاں کرنی شروع کر دیں- چچا زاد سارہ ملک نے کافی اُدھم مچایا- رونا پیٹنا کیا- منت ترلے کئے مگر جنید ملک کے دل کا پتھر نہ پگھلا- پڑھائی اور کاروبار سے فراغت ملی تو اُس کی نظر سمعیہ پر پڑی- ہمیشہ کی ہنس مکھ، زندہ دل اور ذہین لڑکی- بے شک وہ اُس سے دس سال چھوٹی تھی- مگر عمروں کا کیا ہے- یوں زندگی میں پہلی مرتبہ جنید کے دل میں کسی لہر نے سر اُٹھایا تھا- اور وہ پور پور سمعیہ ملک کی تازہ دم شخصیت میں ڈوبتا چلا گیا-

چھوٹے چچا کی لاڈلی بیٹی سمعیہ نے آئینے میں دیکھا - بھلا مجھ میں کیا خاص بات ہے- خاندان کی تقریباً سبھی لڑکیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں مگر اُس کو کوئی نہ بھائی اور میں سادہ سی پڑھاکو لڑکی! وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی- مگر "کیوپڈ" اپنا تیر چلا چکا تھا- کسی کو چاہنا اور چاہا جانا اچھا لگتا ہے-

وقت دونوں کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ خرام چلنے لگا- سمعیہ ایم ایس سی سائیکالوجی کے آخری سمسٹر میں تھی- گھر میں رشتے کی باتیں ہونے لگیں- تو جنید کا سراپا رُوپ آپ آنکھوں میں اُتر آیا- وقت نے دبے پاؤں کچھ پھول لا کر اُس کے دل میں کھلائے تھے- کچھ خواب پلکوں میں جگنو بنے تھے- مگر تایا کی فرمائش کے باوجود ابا جان کا انکار کسی کی سمجھ میں نہیں آیا- اور وہ تو حیرت سے گنگ تھی- ابا کے سامنے کبھی اُونچی آواز میں بات ہی نہیں کی تھی - سب کچھ بغیر مانگے ہی ملتا رہا-

ابا کو یہ خبر ہی نہیں تھی کہ جنید ملک سمعیہ کے دل کے تخت پر براجمان ہو چکا ہے- آذر بھائی نے پوچھا تھا کہ انکار کی وجہ کیا ہے- تو ایک ہی جواب- وہ میری بیٹی کے لائق نہیں- خاندان کا سب سے بانکا سجیلا، لائق فائق لڑکا اُن کی بیٹی کے لائق نہیں تھا- جنید کی فیملی والے سب حیران تھے- سب جتن کر لیے- سمعیہ ابا کی ضد کو تو جانتی تھی- ایک دفعہ انکار اُن کے منہ سے پھسل گیا ہے- وہ مر بھی جائیں تو ہاں نہیں کریں گے- ماں نے کہا- سمعیہ تم خود ابا سے بات کرو- اماں ایک بات بتا دوں- ابا نے اگر مجھے انکار کر دیا- تو پھر میں اس گھر میں کبھی پلٹ کر نہیں آؤں گی- مجھے یہ عادت بھی تو ابا سے ملی ہے-

اور پھر وہ قیامت خیز دن طلوع ہوا- ابا حویلی

کے بڑے سے صحن میں برگد کے نیچے بڑے سے تخت پوش پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ابا آپ سے بات ہو سکتی ہے۔ ابا نے اخبار نیچے کر کے دیکھا۔ سمعیہ ایک عزم لئے باپ کے رُوبرُو تھی۔ ہاں ہاں میری جان۔ میری لاڈو۔ اِدھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔ بہت مصروف رہتی ہو۔ کبھی اِس بوڑھے باپ کی بھی خبر لیا کرو۔ ابا نے شکوہ کیا۔ ابا جان آپ کے اِردگرد ہی رہتی ہوں۔ بس آپ کو نظر نہیں آتی۔ ابا نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ماتھے پر بل بھی پڑا۔ ایسی بات نہیں۔ آؤ بیٹھو۔ ابا ایک بات پوچھنی تھی۔ جی بیٹا جی۔ جنید ملک کو انکار کی وجہ کیا تھی۔ بس یہ جاننا چاہتی ہوں اور یہ جاننا میرا حق بنتا ہے۔ اور ابا تو جیسے کسی انگارے پر بیٹھ گئے ہوں۔ تم یہ کیوں جاننا چاہتی ہو۔ تیور بدلے ہوئے تھے۔ میں ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہوں۔ اپنے اچھے بُرے کی پہچان رکھتی ہوں۔ میری بھلائی اور بہتری کس میں ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں۔ کبھی آپ لوگوں کی عزت پہ داغ نہیں لگنے دیا، اپنی عزت کرنا اور کروانا بھی جانتی ہوں۔ اِس سب کے باوجود مجھ سے رائے مانگے بغیر رشتہ ٹھکرا دینا انصاف ہے۔ بولیے۔

ہاں انصاف ہے۔ ابا دھاڑے۔ وہ لڑکا اِس قابل نہیں رہ گیا۔ ساری زندگی رشتے پیش کرتے رہے۔ اُس نے کبھی پروا نہیں کی۔ سارے خاندان کی لڑکیوں کو اُس نے رد کیا۔ حتیٰ کہ میرے خاص دوست اور پارٹنر رضوان بیگ کی اِکلوتی بیٹی کو انکار کر دیا۔ میں اُسے پسند نہیں کرتا اور میں اپنی بیٹی سے ہرگز اُس کی شادی نہیں کروں گا۔ آپ کے دل میں اتنی نفرت ہے تو پھر میرے لیے محبت اور نرمی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر میں کہوں کہ مجھے جنید پسند ہے، تو سمعیہ کا لہجہ بھی سخت ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ پھر بھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ تو پھر میرا فیصلہ بھی سُن لیجیے۔ اگر جنید نہیں تو کوئی اور نہیں۔ ضد تو پھر ضد ہوتی ہے نا۔ ابا نے حیرت سے سمعیہ کو دیکھا۔ تم بغاوت کرو گی۔ نہیں بغاوت نہیں۔ مگر کبھی شادی نہیں کروں گی اور دوسری بات میں سکالرشپ پر ملک سے باہر جا رہی ہوں۔ پہلے تو شائد نہ جاتی۔ مگر اب مشکل ہے یہاں رہنا۔ ابا کا تو پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ وہ سمعیہ کو قتل ہی کر دینا چاہتے تھے۔ آذر بھائی اور اماں نے بمشکل ٹھنڈا کیا۔ آپ مان کیوں نہیں جاتے۔ ماں نے اشکوں سے بھری التجا کی۔ میرے سامنے نام مت لو اُس بدبخت کا۔ مذاق بنا کے رکھا ہے۔ جنید کو بھی اِس بات کی بھنک پڑ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ شرمندہ رہنے لگا۔ چچا اُس سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ مگر کبھی ظاہر نہیں کی۔ مگر سمعیہ کے ساتھ اُن کا رویہ۔ اُسے اچھا نہیں لگا۔ یہ زیادتی ہے چچا جان کی۔ وہ بہت دُکھی تھا۔ کڑھتا رہتا۔ سمعیہ سے ملنا چاہتا تھا مگر اب وہ چچا کے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ گھر میں جیسے کوئی سوگ پھیلا ہوا تھا۔ سب ایک دوسرے سے نظریں چُراتے

پھرتے۔ وقت نے رینگنا شروع کر دیا۔ ایک دن سمعیہ نے رختِ سفر باندھ لیا۔ ماں نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ اَبا کو تخت پوش پر چُپ چاپ لیٹے دیکھا۔ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔ دُور سے ہی سلام کیا اور بھائی کے ساتھ سامان تھامے گھر سے نکل گئی۔ ہمیشہ کے لیے۔ وہ چاہتی تھی اَبا کو اُس کی کمی محسوس ہو۔ وہ اپنے ضدی رویے پر غور کریں۔ شائد وہ اپنے اندر کی نفرت کو کم کر سکیں۔

اَبا خاموش لیٹے دُھوپ سے بھرے آسمان کو تک رہے تھے۔ اِکا دُکا پرندے اِدھر سے اُدھر اُڑ رہے تھے۔ کہیں کہیں بادل بھی سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ پتوں کی تال برابر جاری تھی۔ جب اماں آنسو صاف کرتی اَبا کا کھانا لیے چلی آئی۔ اَبا نے غور سے بیوی کو دیکھا۔ کیا ہوا؟ کوئی مر گیا ہے خاندان میں؟ کچھ نہیں آپ کھانا کھائیں۔ آپ کو کیا۔ کوئی مرے یا جیئے۔ ہوا کیا ہے؟ اَبا اَبل ہی پڑے کچھ بتاؤ گی۔ سمعیہ چلی گئی ہے۔ کیا وہ زور سے چیخے۔ کہاں چلی گئی ہے۔ کسی خدشے کے پیشِ نظر وہ بدحواس ہو گئے۔ میری اجازت کے بغیر، وہ تڑپ کر رہ گئے۔ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ پر ہی گئی ہے۔ آنسو تواتر سے اُس کا دامن بھگو رہے تھے۔ آذر چھوڑنے گیا ہے۔ اچھا وہ بدمعاش اُس سے ملا ہوا ہے۔ جنید کا چچہ۔ اسے آلینے دو۔ پوچھتا ہوں اُس سے۔ اب کیا بیٹے کو بھی گھر سے نکالیں گے۔ وہ دہل کر رہ گئی۔ اُٹھا لو یہ کھانا۔ وہ پوری جان سے سُلگ رہے تھے۔ بیٹی کے پَر نکل آئے تھے۔ ساری زندگی خاموش رہنے والی نے بلآخر کیسا تیر مارا تھا۔ اَبا جانتے ہی نہ تھے کہ اُن کی ضد کی قیمت اُن کی اولاد کو چکانی ہو گی۔ آذر دُکھی دل کے ساتھ بہن کو رُخصت کر آیا۔ بہت اُداس اور کھویا کھویا سا۔ جیسے کچھ گم ہو گیا ہو۔ اَبا سے خوب لڑائی ہوئی۔ سارا الزام آذر پر آ گیا۔ وہ چُپ چاپ اپنے کام پر نکل جاتا۔ اماں سارا دن اُداس گھومتی۔ اَبا چُپ چاپ آسمان کو گھورتے رہتے۔

قیامت تو جنید کے دل پر گزر رہی تھی۔ اُس کی محبت میں کھوٹ نہیں تھی۔ سمعیہ نے جوانمردی دکھائی۔ اپنے حق کے لئے آواز اُٹھائی۔ جنید نے بھی کہیں شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ سمعیہ کی یاد سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ اُس نے اپنا بزنس اسلام آباد میں منتقل کر لیا۔ وہ لاہور کو بھول جانا چاہتا تھا۔ وقت آگے سرکتا رہا۔

تایا جان کی بیماری اور موت نے سارے خاندان کو اکٹھا کیا۔ جنید بھی موجود تھا۔ ٹوٹا ہوا مرجھایا سا۔ باپ کی موت نے اُسے مزید توڑ دیا تھا۔

چچا بھی آئے تھے۔ ملے بھی تھے۔ شائد افسوس کے چند کلمات کہے بھی تھے۔ آذر بھی وہیں تھا۔ ایک دن آذر نے ہی کہا

تھا۔ یار کہیں شادی کر لے۔ تایا کی حسرت ہی رہ گئی تجھے دُولہا بنانے کی۔ آذر یار یہ دلوں کے سودے ہیں۔ مشکلوں سے طے ہوتے ہیں۔ تو جانتا ہے میں نے ساری زندگی کسی لڑکی کو گھاس نہیں ڈالی۔

سمعیہ کیوں پسند آ گئی تھی۔ نہیں جانتا۔ بس پھر اس کے معیار کی کوئی لڑکی دُنیا میں ہے ہی نہیں۔ سمعیہ نے شادی نہیں کی تو میں کیسے کر سکتا ہوں۔ اُس کا گنہگار بن جاؤں گا۔ جنید تمہیں سمجھنا مشکل ہے۔ سر پہ سفید بالوں کے ساتھ اور گریس فل ہو گئے ہو۔ مذاق نہ اُڑاؤ۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ سارے خاندان میں بس اسی جوڑے کے چرچے تھے۔ ابا کی سخت طبیعت کی وجہ سے کوئی اُن سے بات نہیں کرتا تھا۔ ابا بیمار رہنے لگے تھے۔ مدتوں سے بیٹی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ کبھی واپس ہی نہیں آئی۔ کہاں آتی۔ بس آذر سے ٹیلی فونک رابطہ تھا۔ کبھی کبھار اماں سے بات کر لیتی۔ گھریلو حالات اور تایا کی موت نے اُسے آزردہ کیا تھا۔ ابا کی طبیعت دن بدن خراب رہنے لگی۔ پہلے والا طنطنہ باقی نہ رہا تھا۔ اب خود کو تایا کی موت کا ذمہ دار سمجھتے۔ جنید اور سمعیہ کے ساتھ زیادتی کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

آذر میری بات سُنو۔ وہ کمزور سی آواز میں بولے۔ جی ابا۔ وہ جنید اور سمعیہ کو بُلاؤ۔۔ میں مرنے سے پہلے اُن کا نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ ابا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ سمعیہ نے اپنی زندگی معذور بچوں کے ایک ادارے کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ بس ایک دفعہ اُسے بتاؤ۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔ میں نے جنید بیٹے کو بڑا دُکھ دیا ہے۔ وہ تو کتنا سعادت مند بچہ ہے۔ مجھے پتہ ہی نہیں تھا۔ میں ان دونوں کا مجرم ہوں۔ ان سے کہو مجھے معاف کر دیں۔

ابا آپ خود کو سنبھالیں۔ میں بات کرتا ہوں اور پھر دس سال کے طویل عرصہ کے بعد سمعیہ نے اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ وہ کتنی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر سمعیہ ملک انگلینڈ کی ایک شاندار یونیورسٹی میں سائیکالوجی کی پروفیسر تھی۔ السلام علیکم! ابا آپ کیسے ہیں۔ وہ اپنی پروفیسر بیٹی کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھے۔ اتنی بارعب اور شاندار خاتون۔ کیا یہ ان کی بیٹی ہے۔ وہ کتنی ہی دیر اُسے دیکھتے رہے۔ ابا کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں بڑی اذیت میں ہوں۔ میری آخری خواہش کو پورا کر دو۔ جنید کو بھی بلوا لیا گیا۔ سمعیہ کے لاکھ انکار کے باوجود جنید نے اُسے منا ہی لیا تھا۔ پہلی مرتبہ انکار میں اُٹھے ہوئے اُس کے ہاتھ کو جنید نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ موم کی طرح پگھل گئی۔ محبت سے بڑھ کر دنیا میں ابھی کچھ ایجاد نہیں ہوا۔ کچھ ہی دنوں میں سارے خاندان نے دیکھا۔ محبت جیت گئی تھی۔ چلتے ہوئے جھگڑ تھم گئے تھے۔ دونوں ضدی تھے۔ محبت کو کیسے جانے دیتے۔

☆☆☆☆☆

نو پرابلم

کبھی کبھی تو اتنی تھکن ہو جاتی ہے کہ کیا بتاؤں۔ روٹین لائف بور کرنے لگتی ہے۔ پھر دل چاہتا ہے کہ اس زندگی سے کہیں دور بھاگ جاؤں۔ راہِ فرار حاصل کرلوں۔ مگر..... اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

ہُوں ..... میں سمجھ سکتی ہوں۔ ہم سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ حرا نے فائل پر لکھتے لکھتے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ سب ہی روٹین لائف سے اُکتانے لگتے ہیں۔ ''بائی داوے'' آج کا پرابلم کیا ہے؟ اُس نے فاطمہ کے چہرے پر کچھ تلاش کرتے ہوئے پوچھا۔

''واٹ ڈو یو مِن؟'' آج کا پرابلم کیا ہے؟ اُس نے حرا کی نقل اُتاری۔ پوچھ تو ایسے رہی ہو۔ جیسے پوچھتے ہیں۔ آج کا مینیو کیا ہے؟ فاطمہ کے چہرے پر حرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

ہا..... ہا..... ہا جاندار قہقہہ بلند ہوا تو وہ بُرا مناتے ہوئے اپنے کیبن کی طرف چلی گئی۔ اور حرا بھی مسکراتے ہوئے اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

چلو..... آف ٹائم ہے۔ تقریباً ادھے گھنٹے بعد فاطمہ نے اس کے کیبن میں جھانکا۔

ہُوں..... بس ایک منٹ..... وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے مصروف انداز میں بولی تو فاطمہ جلدی سے واپس اپنے کیبن کی طرف گئی۔ جیسے کچھ بھول ہوگئی ہو۔ تیزی سے بڑھتے ہوئے وہ میم عاصمہ سے بُری طرح ٹکرا گئی۔ اوہ..... سو..... سوسوری میم۔ ایکچولی۔ وہ خجالت سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میم عاصمہ نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روک دیا۔

اِٹس اوکے..... نو پرابلم۔ انھوں نے جھک کر اپنا بیگ اور فائلز اٹھائیں اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

حرا تیزی سے تقریباً بھاگتی ہوئی فاطمہ کی طرف آئی۔

کیا ہُوا؟

یار بہت پرابلم ہوگئی ہے۔ اُس نے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا اور اپنے کیبن سے اپنا فون لیا۔

کچھ کہا میم عاصمہ نے؟

نہیں..... مگر آج تیسرا دن ہے کہ میں

نازیہ نور

مسلسل کوئی نہ کوئی غلطی کر دیتی ہوں اور میم عاصمہ نو پرابلم کہہ کر اگنور کر دیتی ہیں۔ لگتا ہے سب غلطیاں نوٹ کرتی جا رہی ہیں۔ اچھا چھوڑو..... جلدی کرو۔ پھر بس نکل جائے گی۔ اس نے یاد دلایا تو فاطمہ تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔ آفس سے باہر آ کر دونوں اپنے روٹ کی طرف بڑھ گئیں۔

زندگی میں بہت سی باتیں اَن کہی ہوتی ہیں جرا..... بہت سے جملے لبوں تک آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ بہت سے احساسات دل کی زمین میں دبے رہتے ہیں اور پر جب کوئی نیا درد..... نیا دکھ اس زمین میں دفن کرنے کے لیے قبر کھودی جائے تو پرانی لاشیں بالکل تازہ اور پہلے سے بھی زیادہ تکلیف دہ بن کر باہر نکل آتی ہیں۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس کو سن رہی تھی تاکہ جان سکے کہ آج کا پرابلم کیا ہے؟

وہ تھی ہی اتنی حساس کے چھوٹی چھوٹی بات کو محسوس کرتی اور پھر سارا دن یا کبھی کبھی تو کئی کئی دن اسی پرابلم کے لیے سوچتی رہتی۔ یا یوں کہہ لیں جب تک وہ کسی نئے مسئلے سے دوچار نہ ہوتی وہ پرانے مسئلے ہی کو لیے بیٹھی رہتی۔

ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔ شاید ہم مسئلوں کے ساتھ رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں یا پھر مسئلے ہمارے ساتھ رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بہرحال جو بھی تھا۔ وہ اس کی طبیعت سے واقف تھی۔ فاطمہ اکثر ان باتوں کے لیے پریشان ہوتی، جن کے لیے پریشان ہونے سے کچھ نہیں ملتا۔

پتہ ہے تیسرا سال ہے اور تقریباً ہر ہفتے کوئی نہ کوئی فیملی ملنے آتی ہے۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ سلسلہ آخر کب تک چلے گا؟

اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔

ہُوں..... تو یہ بات ہے۔ حرا نے دل میں کہا اور خود خاموش رہی۔

آج بھی پھپھو نے کسی فیملی کو بلایا ہے اور مجھے گھر جلدی پہنچنے کو کہا ہے۔

ہُوں.....

کیا ہُوں یار؟ آئی ایم ٹوٹلی سک آف دس کنڈیشن۔ (میں اس صورتِ حال سے بالکل تنگ آ چکی ہوں) اس نے بھیگے لہجے میں کہا۔ اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں سے آنسو صاف کیے۔ جنھیں اگر پونچھا نہ جاتا تو لڑھک کر گالوں پر آ جاتے۔ یہ لو..... حد ہے یار..... بس کو پوائنٹ سے نکلتے دیکھ کر فاطمہ نے افسردگی سے کہا۔ حرا نے بھی

خفگی سے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا۔ اب انھیں اگلی بس کا انتظار کرنا تھا۔

پتہ نہیں۔ کب زندگی کی نحوست جان چھوڑے گی۔ فاطمہ کو آج شدید قسم کا افسردگی کا دورہ پڑا تھا۔

کام ڈاؤن یار۔ کچھ نہیں ہوتا۔ اسی بہانے ذرا موسم کی رنگینی کو انجوائے کرتے ہیں۔ افق پر اُمڈتے کالے بادلوں کو دیکھ کر جرا مسحور ہوئی۔

ہُوں..... انجوائے کرتے ہیں۔ حسب عادت اس نے جرا کی نقل اتاری۔ بارش ہوگئی نا تو ساری انجوائے منٹ بہہ جائے گی۔ اس کی بڑی بڑی گہری آنکھیں مزید بڑی ہوگئیں۔

کچھ نہیں ہوتا۔ نمک کے تھوڑی بنے ہیں جو بہہ جائیں گے۔ اس نے فاطمہ کا نرم و نازو ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک سفید گاڑی ان کے پاس رُکی۔ فاطمہ نے تو چہرہ دوسری جانب موڑ لیا جبکہ جرا یکدم کھڑی ہوگئی۔

اوہ..... میم آپ؟

ادھر کیا کر رہی ہو؟ انھوں نے دونوں سے ایک ساتھ سوال کیا۔

As Usual بس کا Wait کر رہے ہیں۔ جرا خوشدلی سے مسکرائی کہاں جانا ہے؟..... آؤ۔ میں چھوڑ دوں۔

نو۔ نہیں میم۔ تھینکس۔ ہم چلے جائیں گے۔ فاطمہ نے لجاجت سے کہا تو جرا نے اُسے گھورا۔

اوہو..... آجاؤ..... آجاؤ..... سوچ کیا رہی ہو آپ دونوں۔ انھوں نے استفسار کیا۔ اس سے پہلے کہ فاطمہ کوئی بہانہ کرتی جرا جلد سے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے فاطمہ کو بھی بیٹھنا پڑا۔

ارے ایک آگے آجاؤ۔ آپ کی ڈرائیور تھوڑی ہوں۔ میم عاصمہ نے ہنستے ہوئے کہا تو فاطمہ جو ابھی بیٹھ ہی رہی تھی فوراً اگلی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

اتنا ہچکچا کیوں رہی ہو؟ انھیں حیرت ہوئی۔

نہیں..... بس یونہی میم۔

کچھ دیر خاموشی کی نظر ہوگئی۔ کار مناسب رفتار میں آگے بڑھ رہی تھی۔ میم عاصمہ نے ایک دو بار ان دونوں پر نظر ڈالی مگر خاموش رہیں۔ میم عاصمہ پچاس سے پچپن سال کی خاتون تھیں۔ انتہائی سوبر اور پڑھی لکھی خاتون۔ پرسنالٹی بھی بہت شاندار تھی اور اندازِ گفتگو تو بے حد متاثر کن تھا۔ دھیرے دھیرے بات کرتیں۔ اور ٹھہر ٹھہر کر بات کرتیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فاطمہ کو ان کی موجودگی میں گھبراہٹ ہوتی کہ

کہیں وہ ان کے سامنے کوئی غلطی نہ کر بیٹھے۔
حرا اور فاطمہ ایک ہی ٹاؤن کی رہائشی تھیں۔ حرا کا گھر پہلے آیا تو وہ شکریہ ادا کر کے اُتر گئی۔ جبکہ فاطمہ کو اپنے گھر کے لیے مزید دو منٹ کی ڈرائیو درکار تھی۔
میم مجھے بھی اجازت دیں۔
کیوں؟ آپ بھی یہیں رہتی ہو؟
نہیں میم۔ کوئی بات نہیں میں..... میں پیدل چلی جاؤں گی۔ وہ مسکرائی۔
کیا بات ہے فاطمہ؟ آپ اتنا اَن ایزی کیوں فیل کرتی ہیں؟
نہیں میم۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔
ماشاء اللہ آپ پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی ہیں پھر ایسے کیوں گھبراتی ہیں؟ وہ خاموش رہی۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ ہوتا ہے نا کبھی کہ دوسرے کی شخصیت کا رُعب ہمیں خاموش کرا دیتا ہے۔ ہم کسی ٹرانس میں چلے جاتے ہیں۔
دیکھیں فاطمہ..... اس زندگی میں کوئی بھی مکمل اور مطمئن نہیں ہوتا۔ سب ادھورے ہیں۔ ہر چیز ادھوری ہے۔ سب اپنے اپنے حصے کا دکھ اٹھاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی حوصلہ مندی دکھاتا ہے اور کوئی گھبرا جاتا ہے۔ مگر گھبرانے سے دکھ کم نہیں ہو جاتے۔ بس۔ انسان ڈس گریس ہو جاتا ہے۔ آپ یقین کریں موجودہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو پھر کوئی نیا مسئلہ جنم لے لیتا ہے۔
انسان اس دنیا میں سزا کاٹنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ پتہ ہے نا؟ وہ تلخی سے مسکرائیں۔ اماں حوا اور بابا آدم کو جنت سے نکال کر بطور سزا دنیا میں اُتار گیا تھا۔ اب آپ خود ہی بتائیں سزا کاٹنے میں کیسا مزا اور کیسا اطمینان؟ اطمینان تو سزا پوری ہو جانے کے بعد ہی ملے گا۔ بس ہم سب اپنے حصے کی سزائیں کاٹ رہے ہیں۔
میم بس..... بس ادھر..... جی یہ رائٹ سائیڈ پر۔ اپنے گھر کا گیٹ دیکھ کر وہ بولی۔ اور اجازت طلب نگاہوں سے انھیں دیکھا۔ انھوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔ بس اپنی ذات کو ٹو پرابلم کہنا سیکھیں۔ ان مسئلوں میں الجھیں نہیں ان میں سے گزر جائیں۔ کیسے بھی بچ بچا کر گزر جائیں۔ رُکیں نہیں۔ ہر پریشانی پر خود کو سمجھائیں ''ٹو پرابلم'' وہ ہے نا۔ اللہ پر بھروسا کریں اور زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے مسکراتے ہوئے گریس فلی گزر جائیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا جی میم۔ اور بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ گاڑی سے اُتر گئی۔

☆☆☆☆☆

ادیب

ناکام عشق کا تا حیات روگ بعد از حیات بھی رہے گا؟ خالی پیٹ یہ گمان غلط ثابت ہو رہا ہے۔ بدگمانیاں خالی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں اور خوش گمانیاں بھرے پیٹ کی پیداوار ہوتی ہیں۔ خالی پیٹ نے مجھے نئے فلسفہء خودی سے روشناس کرا دیا ہے۔ میں دنیا بدلنے نکلا تھا۔ میں دنیا تو نہ بدل سکا البتہ دنیا نے مجھے کہیں کا چھوڑا۔ شاعروں، افسانہ نگاروں اور مفکروں نے مجھے ایسی دنیا دکھائی جس کا وجود ہی نہ تھا، یہ محض سراب تھا۔ یہ سراب دکھانے والے ادبا بھی کیا اسی سراب کی بھینٹ چڑھے جی رہے ہیں؟ یا کہ اس سراب سے گزر کر نئی دریافت شدہ دنیا میں جی رہے ہیں؟ ایک ایسی دنیا، جو شاعروں، افسانہ نگاروں اور مفکروں نے اپنے لئے خود تخلیق کی ہے؟ انہیں خیالات میں کھویا سمت کا تعین کئے بغیر چلا رہا تھا۔ جب بھوک سے نڈھال ہونے لگا فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے سامنے مناظر شاید خوش نما تھے، لیکن دھندلے نظر آ رہے تھے۔ یہ شاید کسی پارک کے سامنے بنا فٹ پاتھ تھا۔ سوشل میڈیا پر مجھے فالو کرنے والے ہزاروں لوگ اسی شہر میں تھے۔ لیکن... صبح کا ملگجا سماں اور سناٹا، ایسے میں قدموں کی چاپ سنائی دی تو آہٹ کی سمت نظریں دوڑانے سے پہلے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملیں۔ میری جانب چلتے ہوئے آگے بڑھنے والا صبح کی سیر کے اہتمام میں کوئی خوش پوش دکھائی دیا۔ میرے قریب سے گزرتے وقت مجھے نظرانداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہمت کر کے آواز دی۔ ''سنئے''۔ فاصلہ کم ہونے کے باوجود اس نے سنی ان سنی کر دی۔ میں نے دوبارہ آواز بلند کی ''سنئے''۔

محمد شاہد محمود

اس بار وہ رک گیا۔ چند سیکنڈز یوں ہی کھڑا رہا کہ جیسے کچھ سوچ رہا ہو، پھر پلٹ کر میری جانب دیکھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے قریب آنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

''مجھے بھوک لگی ہے۔ دو روز سے بھوکا ہوں''۔

میں نے جواب دے کر پرامید نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیا کرتے ہو؟'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک اور سوال داغ دیا۔

''ادیب ہوں''۔ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اب وہ میری جانب بڑھنے لگا۔ پاس آ کر میرا تنقیدی جائزہ لیا پھر کہا ''ادیب تو نہیں لگتے اور شکل سے غریب بھی نہیں لگتے۔''

''کئی افسانے لکھ چکا ہوں جو اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ شعر بھی کہتا ہوں''۔ میں نے خشک ہونٹوں پر خشک زبان پھیر کر کہا۔

''کیا تمہارے اشعار بھی کبھی شائع ہوئے ہیں؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''نہیں، شعر شائع کرانے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ مجھے بھوک لگی ہے''۔ میں نے جواب دے کر بھوک کا رونا رویا۔

''میں بھی شاعر ہوں۔ اکبر زعفران کا نام سنا ہے؟''

وہ مسکرایا اور گردن اکڑا کر بولا۔

''ارے سر آپ؟ آپ تو بہت بڑے شاعر ہیں معذرت چاہتا ہوں پہچان نہ پایا، بھوک نے بے حال کر رکھا ہے''۔ میں بھوک دبا کر زبردستی مسکرایا۔

''چل اپنا کوئی سا بھی کلام سنا''۔ اکبر زعفران نے جیب سے موبائل فون نکالا۔

''آج خوشی منانے کا دن ہے'' میں نے اپنی لکھی پسندیدہ نظم سنانا شروع کی، اکبر زعفران نظم سننے کے دوران اپنے موبائل فون پر کچھ لکھتا رہا۔

''سر کیسی لگی میری نظم؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اکبر زعفران کی طرف دیکھا۔

''تقطیع میں روانی نہیں ہے۔ عروض کی ع بھی چھو کر گزری ہے۔ دیکھو میاں ابھی سیکھو''۔ یہ کہہ کر اکبر زعفران آگے بڑھ گیا۔

''سر مجھے بھوکا چھوڑ کر آپ آگے بڑھ رہے ہیں؟'' میں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ اتنے میں اکبر زعفران کا موبائل فون بجنے لگا۔

''ہاں کیوں کہ مجھے آگے بڑھنا ہے۔ تم بھوکے ہو اسی لئے آگے نہیں بڑھ سکتے...

ہاں ہیلو، ہاں ہاں پاکستان لٹریچر فیسٹول میں نئے کلام کے ساتھ حاضری ہو گی حضور، بس چیک کاٹ کر سنبھال رکھیے میرے

آقا..."۔ اکبر زعفران مجھے نظر انداز کر کے موبائل فون کان سے لگائے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

"تم کون ہو اور یہاں پارک کے سامنے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ ایک نو وارد کو اچانک دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

"میں بھوکا ادیب ہوں۔ مجھے بھوک لگی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"تم بھوکے تو ہو ہی لیکن احمق بھی ہو۔ اگر ادیب ہو تو جذباتی سا جملہ گتے پر لکھ کر اپنے سامنے رکھو۔ میں نے یورپ اور امریکہ میں اردو ادب کی خدمت میں بڑے بڑے پروگرامز کرائے ہیں۔ وہاں بھوکے ایسا ہی کرتے ہیں"۔ نو وارد بھی آگے بڑھ گیا۔

"سر میری بات تو سن لیں"۔ میں نے التجا کی۔

"تم مجھے آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتے۔ میرا وقت تمھاری بھوک سے کہیں زیادہ اہم ہے"۔ نو وارد نے پلٹ کر جواب دیا اور دوبارہ آگے بڑھنے کی غرض سے واپس مڑا۔

"سر صرف بات ہی تو ہے۔ خدارا سن لیں"۔ میں نے دوبارہ روکنے کی کوشش کی۔

وہ پلٹ آیا جیب سے موبائل فون نکالا اور کال ملا کر کسی سے کہا "میں نے فٹ پاتھ پر بیٹھے کسی بھوکے ادیب کی بات سُنی ہے۔ ٹیم کے ساتھ فوراً آ پہنچو اور ہاں اکبر زعفران کے ہوٹل کے کمرے میں، ناشتے میں کیپوچینو اور کروسینٹ۔ ایک کارٹیٹو، یسپریسو یا کیپوچینو کے ساتھ، تازہ گلاب رکھنے کا کہہ دینا، میں اپنی لوکیشن تمھیں بھیج رہا ہوں"۔

"شکریہ سر میں کہنا چاہتا ہوں میں بھوکا ہوں..."۔ اس سے پہلے میں کھانے کا ذکر کرتا نو وارد نے مجھے ٹوک دیا۔

"بہت جلدی ہے؟ تم سے صبر نہیں ہوتا؟ یہی مسئلہ ہے تم چھوٹے لوگوں کا۔ رکو ابھی..." نو وارد اتنا کہہ کر ٹہلنے لگا۔

تھوڑی دیر میں دو DSNG وینز تیزی سے آ کر قریب ہی رک گئیں۔ کیمرے، مائیک اور لائٹس آناً فاناً سیٹ ہو گئے۔ آن کی آن میری بات سنی جانے لگی۔

"ہمارے ملک کا قیمتی سرمایہ فٹ پاتھ پر بھوکا بیٹھا ہے۔ ہمارا کام ایسے باصلاحیت قیمتی موتی چننا ہے، جنھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے"۔

نو وارد اور گاڑیاں مجھے وہیں بھوکا بیٹھا چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں۔ بھوک کے مارے مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ میں نیم بے ہوش صرف سن سکتا تھا۔ کافی دیر بعد کچھ لوگوں نے مجھے وہاں سے اٹھا کر کسی بنچ پر لٹا دیا۔ وہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک

آواز سنائی دی کہ "ہمارے ملک کے عظیم ادیب امجد اسلام امجد صاحب چل بسے"۔
مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں، بھوک نے مجھے بھلا دیا تھا کہ امجد اسلام امجد کون ہے۔
دوسری آواز سنائی دی "اکبر زعفران نے اس صدمے کے موقع پر اپنی نئی نظم، آج خوشی منانے کا دن ہے' سنا دی، حد تو ہے یار گزشتہ روز ٹھیک آٹھ بجے جس دوران امجد اسلام امجد صاحب کی تدفین کی جا رہی تھی، اسی دوران پاکستان لٹریچر فیسٹول کا آغاز رنگ و بو اور موسیقی سے کیا گیا، انہیں پیسے کی بھوک نے سب بھلا دیا ہے۔
یہ سن کر میں بتا نہیں سکتا تھا کہ یہ میری نظم ہے۔ اگر بتا بھی دیتا تو کیا کوئی میری بات پر یقین کرتا؟ مجھے لکھنے سے عشق ہے۔ لیکن لکھنے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ ناکام عشق کا تاحیات روگ بعد از حیات بھی رہے گا؟ خالی پیٹ نے مجھے نئے فلسفہ خودی سے روشناس کرا دیا تھا۔
مجھے علاج معالجہ دوا کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے روٹی کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں میں بچ پاؤں گا یا نہیں، اگر بچ گیا تو؟
غریب کو شکل سے بھی غریب نظر آنا چاہیے۔ اگر بچ گیا تو چہرے پر دھول مٹی مل لوں گا، غریب ادیب نظر آنے کی کوشش کروں گا۔ شاید ملک کا وہ ادارہ مجھے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر لکھنے پر مامور کر دے...!
یہی نیا فلسفہ خودی ہے۔
مکمل بے ہوشی میں جانے سے پہلے مجھے کچھ اور آوازیں سنائی دیں۔
پہلی آواز سنائی دی کہ "ہاں یہی ہے جس کی خبر آج بار بار دکھائی جا رہی ہے"۔
دوسری آواز سنائی دی کہ "ہاں لگ تو وہی رہا ہے"۔
دوسری آواز لاکھوں آوازوں میں واضح طور پہچان سکتا تھا۔ میں اس آواز کا فین ہوں۔ یہ آواز انسان دوست کی آواز تھی۔ امید کی رمق، جینے خواہش اور لکھنے کا جنون از سر نو سر اٹھانے لگا۔ یہ اس دوسری آواز کا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔
پہلی آواز، "اب کرنا کیا ہے؟"
دوسری آواز، "یہ مڈل کلاس لوگ ہمیشہ ہمیں سیڑھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج ہم اسے سیڑھی بنائیں گے، ایڈیٹ کئے بغیر اور بجٹل مکمل ریکارڈنگ پانچ لاکھ میں خریدی ہے۔ لڑکوں کو بلاؤ اسے اٹھا کر سڑک کے بیچوں بیچ رکھیں۔ چلو آگے بڑھو، ہمیں آگے بڑھنا ہے"۔

☆☆☆☆☆

جہاز پر [افسانچہ]

اصل نام تو ''دانا'' تھا مگر عرف میں ''بودلا'' رائج تھا۔ پانچویں سکیل کا وفاقی محکمے کا سرکاری ملازم تھا۔ کافی سروس ہو گئی تھی۔ بڑے چٹکلے اور خود ساختہ اقوال ساتھی ملازمین کو سنایا کرتا۔ موقع کی مناسبت سے کہتا کہ سیانے سچ کہتے ہیں کہ افسر کے سامنے سے نہ گزرو اور گھوڑے کے پیچھے سے۔ بظاہر سادہ سا، بھولا بھالا مگر عملوں کا پورا تھا۔ اتنے طویل عرصے کام کو ''کونین'' (ملیریا کی کڑوی گولی) سمجھنے والا کوئی قابلِ ذکر فریضہ سرانجام نہ دے سکا۔

اچانک موبائل فون کا دور آ گیا اور تمام ملازمین کے پاس سیل فون کا ہونا لازم اور ملازمت کی مجبوری قرار پایا۔ بودلے نے ٹال مٹول تو کافی کی مگر بادلِ ناخواستہ خریدنا ہی پڑا۔ پہلے تو افسروں کی نظروں سے اوجھل رہا کرتا تھا اب بچنے کی کوئی صورت نہ تھی جب ضرورت پڑتی اس کے نمبر پر کال آ جاتی۔ بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ ابھی ملازمت بھی کافی باقی تھی چھوڑی بھی نہیں جا سکتی تھی اور اتنا عرصہ کام چوری کی عادت کے باعث کر پانا بھی بس کا روگ نہ تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد موبائیل فون کے ماہرین فون کے پاس شاپ پر گیا اور کہا

یار!

موبائل پر افسروں کی ہر وقت کی بک بک سے جان چھڑانے کا کوئی حل بتاؤ۔ میں تو موبائل آنے سے بہت تنگ آ چکا ہوں

موبابل ایکسپرٹ۔ مطلب

بودلا۔ یار مطلب کیا۔ اتنے بودلے بھی نہیں ہو

موبائل ایکسپرٹ ۔''میرے بھائی ہمارے پاس ان پہیلیوں اور بجھارتوں کا وقت نہیں، جلدی کام بتاؤ

بودلا۔ جھنجھلا کر۔۔۔ یار موبائل سے تنگ ہوں کچھ ایسا کرو کہ موبائل بند ہونے کا پتہ بھی نہ چلے اور افسروں کی مجھے کال بھی موصول نہ ہو

موبائل ایکسپرٹ۔ ''بس اتنا سا کام ہے؟ لا مجھے دے۔ جھٹ سے موبائل سیٹ کر

عاصم بخاری

کے واپس کر دیا۔ یہ لے ہو گیا
بودلا۔ یار کچھ سمجھا تو سہی کیا کیا؟
کیا ہو گیا؟
موبائل ایکسپرٹ۔ ''اب کال نہیں آئے گی اور موبائل بھی بند نہ ہو گا۔
بودلا ''۔یار'' سمجھا تو سہی آخر ایسا کیا کیا
موبائل ایکسپرٹ۔ '' aeroplane mode پر لگایا۔
بودلا ''یار مجھے سمجھ نہیں آئی ۔ان پڑھ ہوں۔ اپنی زبان میں سمجھاؤ
موبائل ایکسپرٹ۔ اچھا
سوری، سوری ادھر آؤ دیکھو یہ سکرین پر جہاز بنا ہوا نظر آ رہا ہے؟ جہاز پر لگایا
بودلا۔ ''ہاں یار اتنا بھی بودلا نہیں ہوں۔ بس اسی کو کلک کرنا ہے۔ اچھا یہ تو بہت آسان کام ہے ۔یہ تو میں خود بھی بڑی آسانی سے کر لوں گا اور خوشی کے مارے شاپ کے اندر ہی بھنگڑا ڈالنے لگا ۔ setting کے پیسے دے کر دعائیں دیتے رخصت ہوا۔ مطلب جہاز پر لگانا ہے
موبائل ایکسپرٹ۔ ہاں جی جہاز پر
اس حکمت عملی سے بودلے نے سکھ کا سانس لیا۔ سارے ملازمین کو افسران کی کالیں آتی رہتیں مگر بودلا افسروں کے شر سے محفوظ۔

کسی افسر سے کوئی رابطہ نہیں ہر وقت اس کا موبائل جہاز پر (aeroplane mode) ہی رہنے لگا
اچانک ایک دن ساتھیوں کی محفل گرمائے بیٹھا تھا کہ ایک ملازم نے آ کر اسے ایک کاغذ تھمایا۔
بودلا۔ ''یار یہ کیا ہے؟''
ملازم۔ خود پڑھ لو
بودلا۔۔۔یار، میں اتنا پڑھا لکھا ہوتا تو چھپتا پھرتا۔ بتاؤ
ملازم۔ ''آپ کا کوئٹہ بلوچستان کے دور دراز علاقہ سمگلی تبادلہ کر دیا گیا ہے۔ جہاز تیار ہے وہ دیکھو جہاز۔۔۔ پلیٹ فارم پر لگا ہوا ہے جلدی پہنچو ورنہ
بودلا۔ یار۔۔۔ ورنہ کیا؟
ورنہ کا مطلب ہے ادھر زمینی رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی موبائل سگنل سروس۔۔۔ صرف اور صرف جہاز پر ہی۔۔۔
بودلا بھاگتا بھاگتا جلدی سے جہاز تک پہنچا۔ سوار ہوا، جہاز نے اڑان بھری۔۔۔۔ زمین چھوڑنے کے جھٹکے کے ساتھ ہی ''بودلے'' کی ہارٹ اٹیک سے روح پرواز کر گئی ''جہاز پر''۔۔۔

☆☆☆☆☆

وہ جو چاند تھا سرِ آسماں (طنز و مزاح)

اور چاند نظر آ ہی گیا----!!!

کتنا مسحور کن اور دل فریب ہوتا ہے چاند دیکھنے کا نظارہ-

چاند زمین کا ہو یا آسمان کا، اسے دیکھنا ہمیشہ ہی ہر کسی کے لیے سرخوشی اور سرشاری کا باعث ثابت ہوا ہے تو دوسری طرف یہ انسانوں بلکہ مسلمانوں کے درمیان نزع و اختلاف کا باعث بھی بنا رہا ہے- کب اور کیسے دیکھا سے لے کر کیوں دیکھ رہے ہو تک کے تمام دلچسپ مرحلے اس سفر میں تیزی سے طے ہو جاتے ہیں- بعض بعض موقعوں پر تو معاملہ باقاعدہ ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جاتا ہے مگر اس اختلاف کے باوجود ہمارے ہاں چاند دیکھنے کا خوب اہتمام کیا جاتا ہے- خوب تیاریاں ہوتی ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کی دیرینہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں چاند کو اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھ لے- دوسروں کی آنکھوں دیکھے جانے والے چاند کا قطعی اعتبار تک نہیں کیا جاتا بلکہ ہمیشہ اسے شک و شبے کی نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے- رویت ہلال کا معاملہ ہی دیکھ لیجئے- ملک خداداد میں قانونی طور پر چاند دیکھنے کے لیے ایک سرکاری کمیٹی قائم ہے جو ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے شہر میں بیٹھک جما کے پہلے تو خود چاند ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہے (غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق کمیٹی آج تک خود کبھی بھی چاند دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے اور ہمیشہ سے اپنا کام دوسروں کے دیکھے چاند سے ہی چلاتی آئی ہے) اور ناکام ہو کر ارد گرد سے آمدہ اطلاعات پر چاند نظر آنے یا نہ آنے کا فیصلہ کرتی ہے مگر بدقسمتی سے اس کمیٹی کے فیصلے کو کبھی بھی خوش دلی سے قبول نہیں کیا گیا- رمضان اور عید کے چاند پر ہمیشہ یہی صورت حال بنتی ہے- پشاور کے چاند کو لاہور اور کراچی حتیٰ کہ اسلام آباد پنڈی والے بھی شک و اختلاف کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کا قطعی اعتبار نہیں کرتے- پشاور والے البتہ شاید فطری عاشقان چاند واقع ہوئے ہیں اس لئے وہ نہ صرف خود چاند دیکھنے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں بلکہ ہر کسی کے چاند کو مانتے اور تسلیم بھی کرتے ہیں اور ملک کے کسی بھی افق پہ نمودار ہونے والے چاند کو ہمیشہ پسندیدگی اور محبت کی نظر سے ہی دیکھتے ہیں- ہاں البتہ ان کی ضد یہ ضرور ہوتی ہے کہ چاند کو بس نظر آنا چاہیے خواہ لاہور اور کراچی میں ہو یا پشاور و وزیرستان میں-

پشتو کا مشہور مقولہ ہے کہ "چاند ہمیشہ پہلی

نور کمال شاہ

رات کو ہی دیکھا جاتا ہے، بعد میں تو لوگ اس کی روشنی میں گھومتے ہیں"- چنانچہ چاند رمضان کا ہو یا عید کا، خدا رسیدہ بزرگوں کے ساتھ ساتھ من چلے نوجوان اور طفلان سیماب صفت تک اسے تلاش کر کے دیکھنے کی جستجو ضرور کرتے ہیں - بزرگ کھلے میدانوں میں نکل کر اور نوجوان مکانوں کی چھت پر چڑھ کر اوپر سے ہی اپنے اپنے چاند کو ڈھونڈنے اور دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں - نوجوان چونکہ بلند چھتوں کے اوپر سے نظارہ دیکھنے کی جستجو میں مگن ہوتے ہیں اس لیے ان کی کامیابی کے امکانات کافی روشن ہوتے ہیں اور چھتوں کے اوپر سے نظر کے دام پھیلا کر کسی نہ کسی چاند کو احاطہ بصارت میں لانے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں - چند نظر نہ بھی آئے تو بہت سوں کو چندا تو نظر آ ہی جاتی ہے - اپنے محلے کے رمضو بھائی اس دن ترنگ میں آ کر بڑے رازدارانہ انداز میں بتا رہے تھے، "یار! آپ کی بھابی نے ہمیں چاند رات کو ہی چاند ڈھونڈتے ہوئے چھت پر دیکھ کر پسند کر لیا تھا اور وہاں سے ہی گویا اس عشق اور رشتے کی گاڑی چلنی شروع ہو گئی تھی؛ بس یار اس کے بعد سے کبھی چاند کھوجنے کا موقع نہیں ملا اور نہ ہی کبھی اس کی ہمت پڑی"-

نوجوانوں کے ساتھ ساتھ چاند دیکھنے کے متمنی بزرگ صورت سفید ریش حضرات بھی ہوتے ہیں مگر بہ سبب ضعف بصارت اور اپنی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے وہ اس عمل میں کافی احتیاط برتتے نظر آتے ہیں کہ مبادا ان کی کسی نادانی سے نوجوانوں کو شرمندہ نہ ہونا پڑے-

بہرحال ہمارے ہاں چاند دیکھا جاتا ہے؛ اور کھل کے دیکھا جاتا ہے - اعلانات بھی ہوتے ہیں اور یوں اعتراضات بھی اٹھتے ہیں (خصوصاً اگر چاند پشاور میں نظر آیا ہو)- میری نظر میں پشاور کی چاند پر اعتراض کرنے والے شاید اپنے حق اور حد دونوں سے بیک وقت تجاوز کرتے نظر آتے ہیں کیوں کہ دستور پاکستان کے تحت اہالیان پشاور کو اپنا چاند دیکھنے کی مکمل آزادی حاصل ہے- ہاں اگر وہ پنڈی یا لاہور کے چاند کو دیکھنے کی ضد کریں تو پھر نامناسب سی بات ہوگی - ایک بات اور بھی محل نظر ہے کہ پشاور والوں نے تو پنڈی یا کراچی کے چاند پر کبھی اعتراض نہیں کیا تو جواباً فریقین مخالف کو بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے- بہرحال چاند نظر آنے یا نہ آنے، دیکھنے یا نہ دیکھنے پر خاصا اختلاف موجود ہے جو معاشرتی سطح سے لے کر مذہبی اور سیاسی سطح تک سردیوں کی شال کے مانند کافی پھیلا ہوا ہے اور فی الحال اس اختلاف کے اختتام کے کچھ آثار بھی نظر نہیں آ رہے- فقیر کی رائے میں اس اختلاف و نزاع کا سیدھا سادہ حل بس یہی نظر آتا ہے کہ پشاوریوں کی طرح لاہور، اسلام آباد اور کراچی والوں کو بھی اپنا اپنا چاند دیکھنے کا حق ملنا چاہیے اور ضروری ہے کہ وہ بھی

اپنا اپنا چاند دیکھنے کی کوشش و جستجو کریں بلکہ اپنی اہمیت و اولیت ثابت کرنے کے لئے پشاور سے پہلے چاند دیکھ لینا چاہیے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ پشاور والے ان کے چاند کو مانتے ہیں یا نہیں۔

رویت ہلال والے ہر مہینے چاند دیکھنے کا باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں اور بلند چھتوں پہ چڑھ کے طاقتور دوربینوں کے ذریعے اسے کھوجنے کی جستجو کرتے ہیں۔ رویت ہلال کمیٹی کا مقصد اولین چاند دیکھنا ہے اور خود ناکام ہونے پر علاقہ بھر سے چاند کے دعوے داروں کو ایک مرکز پہ اکٹھا کر کے ان کی گواہی لیتی ہوتی ہے۔ ان بزرگ صورت اہلیان ہلال کی اولین کوشش یہی ہوتی ہے کہ چاند کسی طرح نظر ہی نہ آئے۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹھک کے لیے ایسے شہر کا انتخاب کرتے ہیں جہاں یا تو مطلع ابر آلود ہو یا ویسے بھی رویت چاند کا امکان کم کم ہو۔

چاند دیکھنے والوں پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ یہ بندے دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں اور جھوٹی گواہی دے کر قوم اور کمیٹی کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ گواہ عموماً عادی نشئی ہوتے ہیں۔ اور نشے کی حالت میں دروغ بیانی کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں دروغ گوئی کا یہ بے سروپا الزام سراسر غلط اور بے انصافی پر مبنی ہے۔ نشے کی حالت میں ان نظر بازوں کو ہر طرف اگر چاند ہی چاند دکھائی دے تو اس میں ان بے چاروں کا آخر کیا قصور اور جھوٹ کہاں سے ثابت ہوتا ہے بھلا اس معاملے میں۔ نشے اور دیوانگی میں سب کچھ ممکن اور جائز ہے۔ مجنوں کو بھی تو ہر شے میں لیلیٰ ہی کا جلوہ نظر آتا تھا اور محض لیلیٰ کے کتے کو دیکھ کر بھی وہ لیلیٰ لیلیٰ کی گردان شروع کر دیتا تھا۔

استاد یاری خان معتوب کی رائے جب اس ضمن میں طلب کی گئی تو اک شان بے نیازی سے فرمانے لگے، ''ہمارے گاؤں میں ہی ایک دفعہ ایک نوجوان نے چاند نظر آنے کا دعویٰ کیا اور اس کی گواہی لے بھی لی گئی۔ اگلی شام کو ہم امام مسجد کی معیت میں متعلقہ نوجوان کو لے کر اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اسے چاند نظر آیا تھا۔ یقین مانیں کہ مطلع صاف ہونے کے باوجود فرد مذکورہ چاند کی نشان دہی نہ کر سکا حالانکہ اس کی گواہی پر ایک دن روزہ رکھا جا چکا تھا۔ میرے خیال میں چاند دیکھنے کا کام رویت ہلال کے ذمے چھوڑ دینا ہی مناسب ہے کیونکہ شرعی اور قانونی طور پر یہ اسی کی ذمہ داری بنتی ہے۔ دراصل ہمیں ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی اتنی عادت پڑ چکی ہے کہ اب اس ٹانگ کو بغیر اڑائے ہمیں سکون ہی نہیں ملتا۔ مذہب، سیاست، عدالت ہر جگہ ہم یہی ٹانگ ہلاتے رہتے ہیں کہ دستور وطن کے مطابق ہمیں تقریر، تحریر اور تو جیہہ کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ جس کا کام اسی کو ساجھے کی مصداق ہمیں اپنے ذاتی امور میں ہی دلچسپی لینی چاہیے اور بس۔ چاند جانے اور رویت ہلال کمیٹی؛ ہمیں بس ان کی پکار پر آمین کہنا چاہیے''۔

☆☆☆☆☆☆

ہم نے بھی مرغیاں پالیں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارا تبادلہ خوشاب میں ہوا تھا۔ خوشاب میں ہم کو جو سرکاری گھر ملا وہ کافی وسیع وعریض تھا اور ہم گھر میں چار افراد۔ جب شام کو ملازم چھٹی کر کے چلے جاتے تو اتنا بڑا گھر کاٹنے کو دوڑتا اور ایک عجیب قسم کی تنہائی، اداسی اور مایوسی کا احساس جاگنے لگتا۔ ویسے تو ہمیں بھی خالی گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا لیکن اس کا زیادہ احساس ہماری زوجہ صاحبہ کو ہوا اور انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ کوئی جانور کو پالا جائے۔ گھر میں اس موضوع پر کافی بحث ہوئی۔ ہم نے کتا پالنے کا مشورہ دیا۔ بیگم صاحبہ نے فوراً رد کر دیا۔ ایک تو خوں خوار جانور ہے اور دوسرا اسلام نے اس جانور کو گھر میں رکھنے سے منع فرمایا ہے کہ گھر میں نحوست پھیلتی ہے۔ ہم نے کہا ہم بلی پال لیتے ہیں۔ بلی خوب صورت ہوتی ہے اور میاؤں میاؤں کرتی ہوئی کتنی پیاری لگتی ہے۔ بلی اس لیے رد ہوگئی کہ بیگم صاحب کے مطابق بلی سے دمہ کا مرض پھیلتا ہے اس لیے وہ ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی گھر میں دو خوں خوار جاں داروں کے ہونے سے تشدد اور لڑائی کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے کتا اور بلی رد ہوئے اور آخرِ کار قرعہ فال مرغیوں کے حق میں نکلا۔

بقول زوجہ صاحبہ کے مرغیاں بڑی بے ضرر مخلوق ہیں اور گھر میں ان کو رکھنے سے گھر میں دیسی انڈے بھی آتے رہیں گے اور اگر کبھی کوئی مرغی بیمار ہوگئی تو دیسی مرغی کی کڑاہی بھی بنائی جاسکتی ہے۔ ان تمام فوائد کے تحت مرغیاں پالنے کا ارادہ پکا ہوگیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مرغیاں کہاں سے لی جائیں۔ ہم نے اس کا ذکر اپنے ڈرائیور سے کیا تو دیکھتے ہیں کہ شام کو ایک جوڑا مرغیوں کا آگیا ہے اور مرغا اذانیں دے کر اپنے آنے کا اعلان کر رہا تھا۔ دنوں دنوں میں بیگم صاحبہ نے کوئی دس بارہ مرغیاں اور تین مرغے اکٹھے کر لیے اور آ، آ، آ پکار کے ان کو دانہ دینا شروع کر دیا۔ صبح، دوپہر، شام ان کو دانا ڈالا جاتا، پانی رکھا جاتا، دانا رکھنے اور پانی رکھنے کی وجہ سے کئی اور پرندے بھی گھر کی منڈیر پر آنا شروع ہو گئے اور گھر میں خوب دھما چوکڑی مچنے لگی۔

ہم نے غور کیا ہے۔ مرغے کا کام اذانیں دینا، لڑنا، دیوار پر چڑھنا اور عشق لڑانا ہے۔ ہم مرغے سے کافی مرعوب ہیں۔ ایک مرغا دس، دس مرغیوں کے ساتھ عشق لڑا سکتا ہے

محمد کلیم

اور مطمئن رکھتا ہے۔ ہم نے ایک دن گنا کہ ایک دن میں مرغا کتنی دفعہ عشق کرتا ہے تو یقین کریں کہ ہماری گنتی ختم ہوگئی لیکن مرغا کا دل نہیں بھرا۔ اس کی عشق بازیاں دیکھ کر ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ ہم بھی مرغا ہوتے۔ جیسے ہم نے بتایا کہ ہمارے پاس تین مرغے تھے لیکن ایک مرغا جس کا نام ہم نے شیرو رکھا ہوا تھا باقی دونوں مرغوں چھوٹو اور چٹو (سفید رنگ تھا اس لیے نام چٹو رکھا ہوا تھا) کو مرغیوں کے قریب نہیں آنے دیتا۔ شیرو کا جب جی چاہتا عشق کرتا لیکن اگر باقی دو کو وہ دیکھ لیتا کہ عشق کی کوشش کر رہے ہیں تو ان کو چونچیں مار مار کر زخمی کر دیتا۔ پانچ چھے مہینے شیرو کا راج رہا۔ پھر ایک دن شیرو اور چٹو کی خوں خوار لڑائی ہوئی اور چٹو جیت گیا اور شیرو ہار گیا۔ وہ دن تھا کہ شیرو کا راج ختم ہوا اور چٹو کا راج شروع ہوا۔ ہم نے غور کیا اسی غم میں شیرو کا وزن کم ہونے لگا اور وہ بیمار رہنے لگا اور شیرو کی آنکھوں میں ایسی کیفیت ہوتی تھی:

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

.....

آخر ہم نے دل برداشتہ شیرو کو اس کیفیت سے نکالا اور دیسی مرغ کی کڑاہی سے لطف اندوز ہوئے لیکن دل میں ہمارے شیرو کا غم بھی تھا۔ پھر اس واقعہ کے کوئی چھے، سات ماہ بعد چٹو اور چھوٹو کی لڑائی ہوئی اور اب فتح چھوٹو کا مقدر بنی اور چٹو کی حالت وہی تھی جو کسی زمانے میں شیرو کی تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اب چٹو کڑاہی بن کر ہمارے سامنے تھا اور چھوٹو پورے گھر میں اذانیں دیتا پھرتا تھا۔ ہم نے جو سبق اس سے سیکھا ہے کہ مرغیاں چاہے آپ کے پاس جتنی ہوں لیکن مرغا صرف ایک ہونا چاہیے۔

مرغیوں اور چوزوں کو دوسرے جانوروں سے بچانا بڑا مشکل ہے۔ جب چوزے ہوتے ہیں تو ان کو بلی کھا جاتی ہے یا پھر چیل آ کر آپ کے ایک دو چوزے اٹھا کر جاتی ہے۔ ایک دفعہ چیل نے ہمارے چوزوں پر جھپٹا مارا اور ہماری آنکھوں کے سامنے دو چوزے اٹھا لے گئی۔ ایک چوزہ اس کے پنجوں سے چھوٹ کر نیچے گر گیا لیکن وہ زندہ نہ بچا۔ اس طرح ہمیں یاد ہے کہ ایک دن ہم صبح اٹھے تو ایک مرغی کے صرف پر پائے۔ کوئی اس کو کھا گیا تھا۔ ہم نے سوچا بلی کی شرارت ہوگی لیکن بلی بڑا پرندہ نہیں کھا سکتی۔ اگلے دن ایک اور مرغی غائب تھی۔ تیسرے دن رات کو گھر کے پچھلے صحن میں کافی شور تھا تو میری نیند کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تین آوارہ کتے ہماری کالی جو کہ اصیل مرغی تھی اس کا شکار کر رہے تھے۔ کالی بہت جان دار مرغی تھی، مضبوط اور طاقت ور۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تین کتوں کے حملوں میں بھی بچ گئی۔ جب ہم نے کتوں کو گھر سے نکالا اور اس کو اٹھایا تو

اس کا دل بڑی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے کہ ابھی باہر آ جائے گا لیکن صاحب داد ہے ''کالی'' کو جو زندہ بچ گئی۔ بعد میں ہم نے اس کو ملازم کو دے دیا اور وہاں بھی تین سال زندہ رہی۔

مرغے رات تین بجے ہی اذانیں دینے لگ جاتے ہیں اور غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقول زوجہ کے مرغوں کا مقصد ہوتا ہے کہ ہم سو نہ پائیں اس لیے وہ اذانیں دیتے رہتے ہیں کیوں کہ نیند بھی تو ایک غفلت ہی ہے۔ اگر ایک مرغا اذان دیتا ہے تو اس کے جواب میں دوسرا مرغا دو اذانیں دیتا ہے اور ایسا مقابلہ شروع ہوتا ہے کہ جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا اور آپ کے کانوں میں ککڑوں کڑوں ککڑوں کڑوں ہوتا رہتا ہے۔ جب ہم نے مرغیاں پالیں تو سارا دن کانوں میں یہی آوازیں گونجتی رہتیں۔ اگر کسی دن مرغے کی ککڑوں کڑوں نہ آتی تو ہمیں شک گزرتا کہ شاید مرغ بیمار ہو گئے ہیں۔ ایک دن ایک صاحب ہمیں ملنے آئے جن کو ہم نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے کہا ہم نے سنا ہے آپ مرغوں کی لڑائی کے شوقین ہیں اس لیے گھر میں تین تین مرغے پال رکھے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ہم پر گھڑوں پانی گر گیا کہ ان مرغوں نے ہماری خوب شہرت کی ہے کہ اور اب ہمیں لوگوں نے مرغ باز سمجھ لیا ہے۔

مرغیوں کی کئی اقسام ہیں مثلاً اصیل مرغی، یہ صرف آٹھ دس انڈے دیتی ہے۔ اس کے بعد کڑک ہو جاتی ہے۔ دیسی مرغی کہ کوئی پچیس تیس انڈے دیتی ہے اور پھر کڑک ہو جاتی ہے اور پھر ہے مصری مرغی۔ یہ انڈے دیتی رہتی ہے اور کڑک نہیں ہوتی۔ اگر آپ کو کبھی مرغیاں انڈوں کے لیے پالنے کا شوق چڑھے تو مصری مرغی پالیں۔ بس جب مرغی انڈہ دے لے گی تو پورا گھر سر پر اٹھا لے گی کٹ کٹ کٹاک، کٹ کٹ کٹاک جیسے کہ اس نے کوئی معرکہ فتح کر لیا ہو۔ اگر آپ نے چوزے نکالنے ہیں تو اصیل مرغی پالیں۔ بیگم صاحبہ نے بھی کئی دفعہ چوزے نکلوائے ہیں۔ چوزے نکل بھی آئیں زندہ کم ہی رہتے ہیں، بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں اور فوراً مرنے کی کرتے ہیں۔

مرغیوں میں بیماریاں بھی کافی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی بیماری ان پر حملہ کرتی ہے، وہ مرنا شروع کر دیتی ہیں۔ بیماری میں مرغی اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے، سست ہو جاتی ہے اور کھڑے کھڑے سوتی رہتی ہے۔ جیسے کچھ انسان ساری عمر آنکھیں کھولے سوتے رہتے ہیں۔ ہم نے لگ بھگ دو سال مرغیاں رکھیں اور اس سے توبہ کر لی کہ آئندہ ایسا شوق کبھی نہ پالیں گے اور ہماری بیگم تو جہاں مرغی کی آواز بھی سنتی ہیں تو وضو کر کے فوراً اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا شروع کر دیتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

بین الاقوامی مباحثہ: اشرافیہ، بدمعاشیہ اور اتفاقیہ حکمرانوں سے بچاو کے طریقے

محترم خواتین و حضرات میں ہوں فارغ النساء استری بیگم آپ کی میزبان اور آپ تمام معزز مہمانان گرامی کی خدمت میں سلام عرض کرنا چاہوں گی۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے پچھلے مباحثے کی گل گھوٹو اور ٹماٹر پھینک ناکامی کے بعد پوری دنیا سے اس بین الاقوامی مباحثے میں حصہ لینے کی غرض سے پچاس نہیں، پندرہ بھی نہیں، دس بھی نہیں بلکہ صرف تین منتخب خواتین و حضرات شامل ہو رہے ہیں۔

خواتین و حضرات - ہمارے آج کے مباحثے کا موضوع انتہائی اہم ہے کہ اشرافیہ، بدمعاشیہ اور اتفاقیہ حکمرانوں سے نجات کس طرح حاصل کی جائے --؟ سب سے پہلے میں بذات خود اس موضوع میں حصہ لینا چاہوں گی۔ میں اس موضوع پر بہت کچھ کہہ سکتی ہوں لیکن پھر یہ سوچتی ہوں کہ اگر میں نے ہی سب کچھ بیان کر دیا تو ہمارے معزز مہمانان گرامی کیا کہیں گے؟ اس لیے میں بلا توقف اپنی پہلی مقطع مہمان کو سٹیج پر بلانے کی دعوت دوں گی۔ آپ کا نام شمیدہ ایلفی ہے۔ اس ملک کی نامی گرامی سیاسی جماعت سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں البتہ افطار پارٹی سے بڑا گہرا اور ذاتی تعلق ہے۔ آپ کی اب تک ایک بھی کتاب منظر عام پر نہیں آسکی البتہ تین لاکھ پانچ سو مربع میل سیلفیاں آپ کی فیس بک آئی ڈی پر جا بجا نظر آسکتی ہیں۔ تو آپ کی بھرپور گالیوں میں سٹیج پر تشریف لاتی ہیں محترمہ شمیدہ ایلفی۔

(شمیدہ ایلفی سٹیج پر تشریف لاتی ہے)

شمیدہ ایلفی: حضرات گرامی: آداب عرض کرنا چاہوں گی--- سب سے پہلے تو میں اپنی میزبان کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ میرا اتنا اعلیٰ تعارف کروایا کہ ایک لمحے کو یقین ہی نہ آیا کہ یہ میں ہوں؟ بہرحال

سیدہ آمنہ ریاض

--- میں جو بھی ہوں اس کا آپ سے کوئی لینا دینا نہیں ہونا چاہیے۔

جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ ہمارا آج کا موضوع کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ میں نے آج تک کبھی کسی چیز کو اتنا اہم نہیں سمجھا جتنا کہ اس موضوع کو سنجیدہ لے لیا ہے۔ کیونکہ آج سے پہلے مجھے کبھی کسی نے کسی پروگرام میں بلایا ہی نہیں۔ پہلے تو اس موضوع کے عنوان پر میں کچھ جملے کہنا چاہوں گی کہ اشرافیہ، بدمعاشیہ اور اتفاقیہ ان سب حضرات کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور اتفاق سے یہ تینوں ہی میرے محلے دار ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب میرے حالات بہت خراب تھے تو میں نے ان تینوں حضرات کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا پڑھا کر اپنے گھر کا خرچہ چلایا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ بھی کہنے کی اجازت نہیں ہے۔۔۔ جاتے جاتے بس اتنا کہنا چاہوں گی کہ تمام حضرات اپنی جیبوں کو مجھ سے بچا کر رکھیں کیونکہ میں دائیں ہاتھ کے بائیں بازو سے جیب بھی کاٹ لیتی ہوں۔ خدا حافظ

میزبان: واہ واہ بہت عمدہ۔۔۔۔۔ کیا ہی دلچسپ اور سونے کے پانی سے لکھنے لائق گفتگو کی ہے۔۔۔ اسی کے ساتھ ہی میں اپنی اگلی مہمان کو اسٹیج پر بلانے کی انٹرنیشنل لیول کی حماقت کرنا چاہوں گی۔۔۔ آپ کا نام کسی رسمی بکواس کا محتاج نہیں ہے۔ میری مراد ہمارا فلم۔ انڈسٹری کے ایک بہت بڑے نام گھمبیرا سے ہے۔ آپ نے مبلغ پانچ سو فلموں میں دل اور ذاتی خرچے پر بڑی محنت سے کام کیا۔ جب آپ کی فلموں پر تبصرہ نگاروں نے تبصرہ کرنا چاہا تو انہیں کام کم اور جمناسٹک کا فن زیادہ نمایاں لگا۔ اسی لیے آپ کی فنی خدمات پر حکومت نے آپ کو حال ہی میں تمغہ حسن برائے کارگردگی سے نوازا ہے۔ تو اسٹیج پر تشریف لا ہیں گی محترمہ گھمبیرا۔

(گھمبیرا اسٹیج پر آتی ہے)

گھمبیرا: میری طرف سے آپ تمام لوگوں کو بہت بہت گڈ آفٹر نون۔ مجھے آج اس مباحثے میں شرکت کر کے جتنی خوشی مل رہی ہے اس کا بیان ممکن نہیں۔ میں اس مباحثے کی شروعات اپنے ایک تازہ مصرعے سے کرنا چاہوں گی:

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

.....

تو خواتین و حضرات! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ موضوع میں نے معاشرتی علوم کی کتاب میں بھی پڑھا تھا اور اسلامیات کے پرچے میں اس عنوان کو اس قدر عمدگی سے

تحریر کیا کہ پورے ایشیا میں میری تھرڈ کلاس پوزیشن آئی تھی۔ اس کامیابی و نامرادی کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اداکاری کرنی چاہیے۔ اسی مناسبت سے میں چاہتی ہوں کہ میری اگلی فلم کا موضوع بھی یہی ہونا چاہیے۔ ہاں البتہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ضرور کرنا چاہوں گی کہ مباحثے کے عنوان کے مطابق میرا کسی بھی جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کی سماعتوں کا بے حد شکریہ۔

میزبان: تو یہ تھیں ہمارے ملک کی صف اول کی فنکارہ جو انتہائی شگفتہ و دل گرفتہ قسم کی گفتگو فرما کر اپنے انجام کو پہنچ گئیں۔

میں اب اپنے اگلے مہمان کا ذکر کرنا چاہوں گی جن کا تعلق فیصل آباد کے تقریباً چھوٹے بڑے تمام علاقوں سے ہے۔ آپ شاعری بھی کرتے ہیں اور مختلف موضوعات پر عوام الناس کا وقت برباد کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ آپ کی نمایاں خصوصیت فن چربہ سازی ہے۔ آپ کا مشہور زمانہ شعر پڑھتے ہوئے آپ کو مباحثے کی دعوت دوں گی۔

ہوگا دنیا میں تو ذلیل و خوار
میرے بچے میرے نونہال

تشریف لاتے ہیں میرے اگلے معزز مہمان علامہ فروری آبادی۔

(علامہ فروری آبادی اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں)

علامہ فروری آبادی:

السلام علیکم کے بعد عرض ہے
آپ کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے

سب سے پہلے تو مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ آپ تمام خواتین و حضرات کے پاس بے تحاشا فالتو وقت ہے۔ کیونکہ آج تک میں نے اپنے اردگرد کوئی مصروف بندہ نہیں دیکھا۔ دوسری بات بہت اہم ہے کہ اس مباحثے میں شریک ہونے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اب ان شاء اللہ اس ملک کے حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوں گے۔ آپ کو ایک بات بتانا چاہوں گا کہ شاعر بننے سے پہلے میں کرکٹ ٹیم میں منتخب ہوا تھا۔ اس بات کو صرف ملک عزیز کے تین سو پینسٹھ لوگ ہی جانتے ہیں۔ باقی لوگ اس لیے نہیں جانتے کہ

جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں۔

ایک بار جب میں انگلستان کے نواحی گاؤں میں میچ کھیلنے گیا تو وہاں کچھ لوگ اسی موضوع پر گفت و شنید کر رہے تھے۔ یقین مانیں میری آج کی گفتگو کے تمام پوائنٹس اسی محفل سے بالکل میری شاعری کی طرح نقل شدہ ہیں۔ آیئے بحث شروع کرتے ہیں۔

اشرافیہ لفظ اشرف سے نکلا ہے جس سے ملتا جلتا لفظ آپ نے کئی بار سن رکھا ہے وہ ہے

اشرف المخلوقات - مجھے امید ہے کہ اس پاک محفل میں بیٹھا ہر دوسرا شخص اشرف المخلوقات ہے جبکہ پہلے کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا- دوسرا لفظ ہے بدمعاشیہ- اس لفظ کا ذاتی اور خصوصی تعلق میرے اپنے گھر سے ہے- کیونکہ یہ زندہ روایت ہے اسی گھر سے چلی ہے-

ابا جان اللہ بخشے یہ لفظ صرف میرے لیے استعمال کیا کرتے تھے- جبکہ یہ سراسران کا وہم تھا کیونکہ وہ اکثر و بیشتر مجھ سے کہا کرتے-

کتھے پراں جا کے مر--- توں بڑا ای کسے بدمعاشیہ دا پتر ایں-

اس مباحثے کا تیسرا لفظ اتفاقیہ ہے- جس کا گہرا تعلق سیدھا میری پیدائش سے ہے - بندہ بذا کے تیرہ بہن بھائیوں کی پیدائش اتفاقیہ ہوئی تھی- جن کو جب ٹٹولا اور کھنگالا گیا تو میں بھی نمودار ہو گیا-

اس لیے ان تینوں الفاظ کا میری زندگی کے ساتھ جنم جنم کی میلی چادر کا ساتھ ہے-

تو خواتین و حضرات یہ تھا میرا مباحثے میں حصہ لینے کا اہم پیغام بنام عوام- میں جانتا ہوں کہ ابھی بھی آپ کے پاس سننے اور سمجھنے کو بہت کچھ باقی ہے - لیکن آپ سے اجتماعی بدتمیزی کے بعد اب اجتماعی اجازت چاہوں گا- خدا کی قسم مجھے کسی بھی طرح کے حکمرانوں سے بچاو کے طریقے ہرگز نہیں آتے- البتہ مچھر، مکھی اور جوئیں مارنے کے سو طریقے ضرور بتا سکتا ہوں-

کہ یہی میری پہلی اور آخری آنے والی کتاب کا پسندیدہ موضوع بھی ہے- آخر میں برملا اعتراف کروں گا کہ جتنا گفتگو کا موقع مجھے آج یہاں دیا گیا ہے اس کی مثال رہتی دنیا تک ملنا ممکن نہیں- فقط والسلام

میزبان: سبحان اللہ --ماشاء اللہ ---

اختتام سے پہلے ایک اہم اعلان کرنا چاہوں گی کہ اس مباحثے میں شامل تمام شرکا و فضلا کی تمام ضائع شدہ گفتگو اب بہت جلد آپ کو کتابی شکل میں بھی دستیاب ہو گی- کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کا وقت کارآمد اور کارہائے نمایاں قسم کی سرگرمیوں میں گزرے- اس مباحثے میں اس ملک کے اہم مسائل پر نہایت سنجیدہ، ذلیلہ، مفصل اور سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے- یہ ہر لحاظ سے بے نظیر و بے مثال طرز کا واحد اور منفرد پروگرام تھا- جس کے بعد میں کہنا چاہوں گی کہ معزز مہمانان گرامی اپنا اپنا فطرانہ، عطرانہ اور ظہرانہ ساتھ لے کر جانا ہرگز نہ بھولیں-

اگلے مباحثے کے لیے ہمیں دیجیے اجازت---فی امان اللہ

☆☆☆☆☆

فیض

خالد احمد

یہ جوئے آب ہے؟
کہ قلزمِ شرابِ ناب ہے
یہ قطرہ قطرہ زندگی، یہ بُوند بُوند روشنی
کسے خبر، یہ جُوئے آب ہے کہ قلزمِ شرابِ ناب ہے

یہ سوچنے کی بات ہے
کہ مے کشوں کے کھوجنے کی بات ہے
یہ آنسوؤں کی آب ہے کہ موتیوں کی تاب ہے؟

کسے خبر یہ بُوند بُوند آبِ تارِ زُلفِ زرنگار میں چمکتے
موتیوں کی طرح
اور کتنے دن ابھی سجی رہے
یہ سَت لڑی ابھی کچھ اور روز تارِ زُلف میں پڑی رہے

کسے خبر کہ زندگی
جھٹک کے بال کس گھڑی، یہ بُوند بُوند روشنی کا ہار
فرش پر بکھیر دے
مگر
کسے خبر، پھر اس خبر کی سنسنی بھی دم وہیں پہ توڑ دے
نظر تو ساتھ دے مگر بدن ہی ساتھ چھوڑ دے
کسے خبر کہ سوچ کا یہ رنگ بھی

کسے خبر کہ سوچ کا یہ ڈھنگ بھی
اَجل کے ساتھ مے کشوں کی دوستی کی بات ہے
ابد نشان گمرہوں کی راستی کی بات ہے
یہ ایک گھور نُور اور روشنی کی بات ہے

دوہے کی بحر نظم

اس کے پہرے دار کے سر میں لگی ہے چوٹ
میں نے شاہی باغ کے، توڑے ہیں اخروٹ

ظاہر باطن ایک سا، ایک ہے سوچ جناب
ماتھا چمکے آپ کا، دل میں رکھیں کھوٹ

بن میں سنہری مور کا، دیکھا کس نے ناچ
گاؤں میں سوہنا بالکا، کھیلے ٹوٹ بٹوٹ

جنگل جھرنا سانوری، پانی بھرتی نار
چھپ کر دیکھے بانورا، پکڑے پیڑ کی اوٹ

بھولے بسرے شہر کو، جانا ثاقب آج
کھول پرِ پرواز کو، دور ہے بالاکوٹ

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

وہ دن بھی آئے

ہمیں بھی دیکھو، اسی تمنا میں جی رہے ہیں
بہار صحنِ چمن میں آئے
مگر یہ عہدِ خزاں ہے جس کا
یہاں پہ خیمہ گڑا ہوا ہے
وہ کون ہوگا!
کہ جس نے پت جھڑ سے
کوئی خفیہ معاہدہ بھی کیا ہوا ہے
کہ اس چمن میں
کسی روش پہ نہ پھول مہکیں
مگر وہ ہم ہیں کہ منتظر ہیں
یہی تمنا ہے کب سے اپنی
وہ دن بھی آئے
کہ صحنِ گلشن میں پازیب گل بھی
چھنک رہی ہو
وہ دن بھی آئے
افق پہ قوسِ قزح کے رنگوں کا دلربا سا
حسیں مرقع دکھائی دے گا
ہمیں بھی دیکھو!
اسی تمنا میں جی رہے ہیں
بہار صحنِ چمن میں آئے

حسن عسکری کاظمی

دُشمن [نثری نظم]

آگ برساتی آنکھوں سے وہ مجھے گھور رہا تھا

اس کے ہاتھ میں پسٹل کی نالی

میری جانب دیکھ رہی تھی

میں بھی اِسی انداز میں پسٹل اُس پر تانے ہوئے تھا

جانی دشمن جانے ہوئے تھا

عین جب میں گولی چلانے لگا

مُجھ سے پہلے اُس نے چلا دی!

ایک دھماکہ۔ گولی میرے سینے میں پیوست ہوئی

مرتے مرتے مَیں نے بھی اُس پر فائر کر ہی دیا

زور کا ایک دھماکا گونجا،

جس سے آئینہ کرچی کرچی ہو کر فرش پہ بِکھرا!

نسیمِ سحر

انتخاب

کس لیے روئیں اور کس کے لیے
چشمِ خونبار کون دیکھے گا!

- خالد احمد -

نعمان منظور

سنگِ میل

مرا چہرہ مری نظروں سے اوجھل تھا
مرے پیشِ نظر آتے کہاں سے خال و خد میرے
مرا دل اس گراں جانی سے بوجھل تھا
میں اپنے آپ سے تھا دور مدہوشی کی حالت میں
جہاں ذات آشنائی کا کوئی رستہ نہ ملتا تھا
مگر پھر یوں ہوا اس خود فراموشی کی حالت میں
کسی نے آئنہ میرے مقابل رکھ دیا آ کر
مرا کھویا ہوا ہمزاد مجھ سے مل گیا آ کر
عطا مجھ کو ہوا اعزاز اپنی ہم رکابی کا
بھلاؤں کس طرح اس کو یہ دن پہچان ہے میری
یہ سنگِ میل ہے گم گشتگی سے بازیابی کا

گلزار بخاری

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

اے مہِ شہرِ تمنا! دل ویراں میں دمک
دیکھ ہم چشم کشا مثلِ بیاباں کیوں ہیں؟

مری ماں!

یونس خیال

مری ماں!
یہ میرے خدوخال سارے
سبھی ہیں تمھارے
رگوں میں لہو، ہڈیاں، گوشت
دل اور فہم وفراست
یہ سب کچھ تمھارا ہی بخشا ہوا ہے
مری دھڑکنوں
اور سانسوں میں تیری ہی
خوشبو بسی ہے
مرا سارا بچپن
وہ ساری جوانی
اور اب یہ بڑھاپا
تمھاری دعاؤں میں لپٹا ہوا ہے
میں تیری دعا تھا، تو میری دعا ہے
تری لوریوں نے
مجھے شاعری کا سلیقہ سکھایا
مری ساری نظمیں
مرے شعر سارے
تمھاری محبت پہ قرباں
مری ماں!

''اور وہ چپ ہیں'' کشمیر کے لیے نظم

کبھی کہ حسنِ جہاں سوز تھا مرا ورثہ
مہکتے کنج گلابوں کے مجھ میں بستے تھے
زمیں کا فرش ذخیرہ تھا لعل و گوہر کا
کرشمہ ساز نے مجھ کو جمال خاک دیا
سخن تراش نے مجھ کو زمیں کا حسن کہا
پھر ایک روز یکا یک مرے نقوش مٹے
عجیب آگ تھی، ہستی کو میری چاٹ گئی
بموں کے غول میں چیخوں کا وہ مچا کہرام
تمام جسم جلا، سوختہ لہو ٹھہرا
چہار سمت تھا سکتہ، یہ پوری دنیا بھی
بہت خموش تھی، گویا کہ کچھ ہوا ہی نہ تھا
مرے وجود نے اک بار پھر مدد چاہی
کسی بھی سمت سے کوئی نہ مہربان ملا
مری نگاہ نے مشرق سے سوے مغرب تک
تمام عالمِ انساں کو متحد پایا
مگر جو چونک کے دیکھا کچھ اپنے لوگوں کو
زباں پہ کلمۂ طیب تھا، ہاتھ میں قرآن
سراپا دین تھے، دولت تھی گرم پانی کی
کسی کے پاس تو ایٹم کی بھی کہانی تھی
یہودی بستیاں تک ہیں حرم میں بسنے کو
ہے پورا عالمِ اسلام یوں تو کہنے کو
کہ روبرو ہے فلسطین، برما و چیچن
کہیں پہ گھات لگی ہے، کہیں پہ دار و رسن
لہو ٹپکتا ہے دن رات ان کناروں پر
کہ جیسے آگ کے شعلے گریں چناروں پر
وہ جن کی ثروت و قوت تلک رسائی ہے
مگر اعانتِ مسلم میں کج ادائی ہے
ستم رسیدہ ہیں ہم دین
اور وہ چپ ہیں
لہو پکارتا رہتا ہے
اور وہ چپ ہیں

فرخندہ شمیم

مزدور

غم سہتا ہوں رنجور ہوں میں بے کس ہوں مگر غیور ہوں میں
ہو کاش اِدھر بھی ایک نظر مُنصف کی نظر سے دُور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

مزدور کے گھر میں پیدا ہوا غم ساتھ مرے پروان چڑھا
مَرجع ہوں میں غم کے شعلوں کا پُر عزم ہوں عکسِ طُور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

فُٹ پاتھ ہی میرا بستر ہے قسمت میں کرائے کا گھر ہے
جس پر نہ کسی نے غور کیا وہ بھُولا ہوا منشور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

وحشت کے فسوں میں اَٹا ہوا دل زخمی دامن پھٹا ہوا
جو پیاس بجھا دے سُولی کی ہر دور کا وہ منصور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

عادی ہوں میں بھُوکا رہنے کا موسم کے تھپیڑے سہنے کا
سُکھ بانٹنے والے دیکھ ذرا دُکھ سہنے پر مجبور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

مہنگائی نے مجھ پر ظلم کیا ہاتھوں کا بھی لُقمہ چھین لیا
رکھ لیں مری سانسیں بھی گروی بھُوکا ہوں تھکن سے چُور ہوں میں
جمہور ہوں میں مزدور ہوں میں

میں خون چھڑکتا ہوں جن پر ڈھاتے ہیں ستم مجھ پر اکثر
محسن ہوں میں اِن زرداروں کا دُنیا میں بہت مشہور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

کھیتوں میں اُگاتا ہوں فصلیں یُوں پال رہا ہوں میں نسلیں
چہرہ ہوں میں اپنی ملّت کا اِس عظمت پر مغرور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

اے دیس ترا مزدور ہوں میں چُن چُن کے غموں کو ماروں گا
ہے عزم کا جھنڈا ہاتھوں میں اِس دور کا اِک تیمور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

دن رات مشینیں چلتی ہیں ہر سمت جو شمعیں جلتی ہیں
اِن میں بھی رواں ہے خون مرا ظلمت میں سحؔر کا نور ہوں میں
اے دیس ترا مزدور ہوں میں

اکرم سحر فارانی

اللہ کے نام

اے میرے پیارے اللہ جی!
آداب عرض ہے!
حد درجہ عافیت ہوگی آکاش ہفت اقلیم کے پار
رحمت کی سرد ہواؤں میں
ٹھنڈی اور شیریں نہروں پر
جو باغ کے نیچے بہتی ہیں
اور جن کو دائم رہنا ہے
ملکوت کے پر ڈھلتے ہوں گے
مسجود گھنیرے پیڑوں پر انوار میں ڈوبا ہر پنچھی
رحمان، رحیم، اے رب کریم!
ہر حمد وثنا کی دستک پر جنت کے در کھلتے ہوں گے
دُنیا کا موسم اچھا ہے!
گرچہ احوال و خیریت بھیدوں کے
جاننے والے پر لحظہ لحظہ ظاہر ہوگی
اعمال کی گٹھری کاندھے پر باندھے ان
بھٹکی راہوں میں
ہم مست خراماں رہتے ہیں
کچھ جان کی پاؤں اماں پہلے، پھر عرض کروں
جو دَم ہے غنیمت ہے لیکن
اس نگری کے ہر گوشے پر اک غضب کا محشر چھایا ہے
ہر سُو کچھ ریزہ ریزہ ہیں
بکھرے ہوئے خواب اس دھرتی پر
اب کم کم حسن کے کھلتے ہیں
خوش رنگ گلاب اس دھرتی پر
اِک بھوک، طلب اور پچھتاوا
اِک آگ، جلن، سلگا لاوا
ہر فرد یہاں تو سرتاپا اک غرض ریا میں اندھا ہے
اِک قحط سا ہے انسانوں کا، یہ دُنیا گورکھ
دھندا ہے
افلاک پہ سورج چلتا ہے
نہ خاک سے راتیں ڈھلتی ہیں
یاں جھوٹ نمائش اور لغزش کی گرم ہوائیں چلتی ہیں
اب مفسد، منکر، باطل بھی
متکبر، جاہل، قاتل بھی
اِک نام کمائے بیٹھے ہیں
وہ عزت شہرت کے تمغے ماتھے پہ سجائے بیٹھے ہیں
اے میرے پیارے اللہ جی!
ہم پاپی نفس کے ماروں کی
راسیں ڈھیلی کیوں چھوڑی ہیں
اے میرے پیارے اللہ جی!
بے سکھ سی صبحوں، شاموں کے سب چاند
اور سورج دھندلے ہیں
اِک امن کی نگری
جنت سی
دُنیا میں دیکھنے کی طالب!

رخشندہ نوید

صریرِ خامہ

ہے میری ہر خوشی، ہر غم تمہاری ہی عنایت سے
لبِ خنداں و چشمِ نَم تمہاری ہی عنایت سے

خوشی کے مُسکراتے رنگوں کی آغوش میں سوئے
ہرے یہ روز و شب برہم تمہاری ہی عنایت سے

مُرادوں کی یہ ساعت اور محرومی کے یہ منظر
کہیں زیادہ کہیں کم کم تمہاری ہی عنایت سے

رگوں میں دوڑتے خُوں سے یہ احساسِ دلِ زندہ
مری سانسوں کی یہ سَرگم تمہاری ہی عنایت سے

یہ سنّاٹے جو میری رُوح کی خاموش وُسعت میں
سُنائی دیتے ہیں ہر دَم تمہاری ہی عنایت سے

شبِ مایوسی سے جنگ آزما اُمّید کی صُبحیں
کیا کرتی ہیں تازہ دَم تمہاری ہی عنایت سے

مری ہر سوچ ہے مرکوز تیرے ہی فسانے پر
تصوّر کے یہ پیچ و خَم تمہاری ہی عنایت سے

ہَوائے قُرب کے جھونکے صدائے وصل کی خُوشبو
جُدائی کے سبھی موسم تمہاری ہی عنایت سے

لکیریں دُھوپ چھاؤں کی یہ تا حدِّ نظر پھیلی
کہیں روشن کہیں مُبہم تمہاری ہی عنایت سے

بہت نازک تصوّر سے بھی نازک سانس کے ڈورے
خیالِ زیستِ مُستحکم تمہاری ہی عنایت سے

سنبھلنے اور گرنے کا ازل سے سلسلہ جاری
بڑھے جاتے ہیں پھر بھی ہم تمہاری ہی عنایت سے

سُلگتے ریگزاروں پر جُھلستے کوہساروں پر
برستے بھیگتے موسم تمہاری ہی عنایت سے

اُداسی اور تنہائی کے اِس تپتے بیاباں میں
یہ گُونجے صدائے غم تمہاری ہی عنایت سے

بہارِ حُسن کے ہونٹوں سے قِصّے ہجر کے سُنتا
یہ پھُولوں کے موسم ہیں تمہاری ہی عنایت سے

فصیلِ جسم و جاں پر دستِ تاریکی میں لہراتے
اُجالوں کے حسیں پرچم تمہاری ہی عنایت سے

کہیں پر جاں بلب ہریالی لُو کے تُند جھونکوں سے
کہیں برسات کی چھم چھم تمہاری ہی عنایت سے

مسلسل گردشِ حالات سے دوچار رہ کر بھی
سلامت ہی رہے دَم خَم تمہاری ہی عنایت سے

کہیں پر گریۂ شیشہ، کہیں پر عکسِ چشمِ نم
یہ تقسیماتِ جامِ جَم تمہاری ہی عنایت سے

نیاز جیراجپوری

یہ ولیے کا چکر

خدا رکھے ولیے کو
اُس نے کہا تھا:
یہاں سے گئے تو جہاں سے گئے!
گلی سیّداں کا بگولا
وہ آدم کا اور ابنِ آدم کا جھولا
وہ ترکھان ولیا، وہ لکڑ بدن
جسم کی لکڑیوں کو اٹھائے
گلی میں نمودار ہوتا تو
سارا محلّہ ہی تیار ہوتا
عرب اونٹ آیا، عرب اونٹ آیا
لو جاپانی گاڑی، ٹرام آسمانی چلی
تب وہ بھورا برادہ،
چپت چپٹیوں سے زیادہ نہ ہوتا
ذرا آ کے رکتا
تو آجاتا حرکت میں
پہلے تو کوہان کو جوڑتا، چپٹیاں ٹھونکتا
سر کو دھڑ سے ملاتا، دو آنکھیں بناتا
پھر اک دُم دگانہ اور اِک شرم گاہ نہ دم کھینچتا
دروِزہ سے نظر ہی نظر میں گزر جاتا
اور پھر جنم لیتا اپنے ہتھوڑے کی ہتھی سے
ضربت کی پارینہ تکرار سے
مجمعِ عام کے سامنے
آفرینش سے اپنی وہ عہدہ برا ہوتا
پیروں پہ یک دم کھڑا ہوتا
جیسے کئی سو برس سے یہیں ہو گلی سیّداں میں
اِسی وسط میں اور اِسی ہست میں
گوشت کتنا گندھا، کیسا ڈھلکا ہوا
کھال کتنی کسی، کیسی پالی ہوئی
ہڈی ہڈی مہارت سے ڈھالی ہوئی
اب یہ کوہان حاضر ہے عربی کی، کہتا
یہ جاپانی گاڑی، ٹرام آسمانی چلی
دو منٹ رہ گئے..... دو منٹ
پورے چکر کی آدھی اٹھنی
ٹکا دادی جاناں، ٹکا دادا جانی
دلھن اور دولھا کا بھاڑا معاف
چلو چار آنے میں سارے طواف
آنے جانے میں گندا بھی صاف!

یہ ولیا تھا
جو ہم کو سیر و سفر کی ہوا میں

شاہین عباس

عمودِ اورافق کی سزاوار معراج پر جا کے
ہچکولے دینے لگا:
آدمی کا بڑا مسئلہ آدمی ہے
یہ جھٹکا تھا
اور ہم بمشکل سنبھل پائے تھے
اُس کے کوہانی استھان پر
دیدنا دید کی سرغنہ ہے گلی، وہ گلی
آسمانی محلے نہیں
اورِ دھرم کا دوشالہ
دوشالے پہ یہ بخیہ بازی
نہ طرفین راضی، نہ کونین راضی

وہیں ہم نے گردن جھکائی اُسی اوج سے
اورِ اُسی سربلندی سے
اعماق کا اِک نشانہ لیا
کل کیا تھا جو ضعفِ نظر کا بہانا
دوبارہ کیا

تب عرب اونٹ ٹھہرا
یہ جاپانی گاڑی، ٹرام آسمانی رکی
دیدنا دید کے مخمصے میں اتر آئے
واپس زمیں پر
کرایے کی آدھی اٹھنی اچھالی کہیں پر!

پیالہ بھر چکا ہے

دمِ رخصت ہے
کتنے کام باقی ہیں
جو کرنا تھے
اگرچہ جانتا تھا سب خسارہ ہے
مگر پھر بھی
گلابوں کو ابھی گلدان میں رکھنے کی فرصت مل نہیں پائی!
کہانی کھل نہیں پائی
محبت بھی ادھوری ہے
محبت کی کہانی کو میں اب کتنا سمیٹوں گا
غزل جو تم پہ کہنا تھی
ابھی وہ ذہن کے پردوں پہ لرزاں ہے
تمہارے لمس کا احساس!

مگر اب کب یہ ممکن ہے کہ کاغذ پر اتاروں میں
مری پوروں کی جانب تک رہی ہے
اسم اعظم کی سنہری روشنی جس نے
تہجد کی دعاؤں میں ہمارا ساتھ دینا تھا
تمہاری یاد چمکے تو درود تاج پڑھتا تھا
مگر اب ہجر خوابوں کی بصارت لے گیا ہے
کہانی اختتامی موڑ پر ہے اور
پیالہ بھر چکا ہے
ہاں!
مری آنکھوں کے پانی سے پیالہ بھر چکا ہے!

زعیم رشید

من کے رنگ

آ تجھ کو بتلاؤں میں جو پایا مَیں نے راز
آنکھیں، خوشبو، چاند ستارے سب کی ہے آواز

میں مَیں بکری سے سیکھا اور کرتا پھرتا تو
سن آواز کبوتر کی جو کہتا اللہ ہُو

پانی، مائی، پیڑ ملیں تو پانی سبز، ہرا
روح میں شامل ہو کر دیکھا پانی لال ہوا

پیلا ہونا اس نے بھی جو سرخ سجیلا ہو
سورج پیدا ہو تو پیلا، مرتا پیلا ہو

گھاؤ کا بھی رنگ ہے نیلا رنج بھی نیلو نیل
دریا، سات سمندر نیلے، نیلا رنگ اصیل

کالا رنگ قلندر پہنیں کالے کی کیا بات
کالے راز چھپائے اماں یا پھر کالی رات

اس کا گھر ہے کالا کوٹھا جس کا کریں طواف
اس کے گھر کا رنگ بھی کالا جس کا کریں طواف
کالے رنگ میں داغ نہ کوئی سب سے ہے شفاف

بے رنگی کی بات ہے اپنی ہے بے رنگ ہوا
ساتوں رنگ ملے تو دیکھا ایک بھی رنگ نہ تھا

رنگ ہیں سارے ایک خدا کے اے بھولے انسان
جو بھی تیرے من کو بھائے اس پر لا ایمان

صغیر احمد صغیر

خالی آنکھوں کا نوحہ

رکھ دی
نیند کی بوتل
گلاس کی تہہ میں
پینے لگے
الفاظ کے بے ساختہ مشروب
دوڑنے لگے
ضرورت بازار کے گردونواح میں
چلنے لگے
دُکھوں کی ریزگاری کے ساتھ
دیکھنے لگے
اپنے جیسے ہم زاد چہروں کی بساط
نجانے
کون سا ریوڑ
گرد آلود زمانوں سے اٹی فضا
خس و خاشاک کا بے ربا نزول
یہ میرے وہم کا لایعنی سلسلہ
نجانے کون سی عبرت
کارزیاں کی سمت پیش قدمی کا سماں ہے
نجانے
کتنی صدیوں کی غلامی کا طوق
ذہنوں میں خوف کی ردا
جذبوں میں احتیاط کا رواج
لفظوں میں تکلف
خیالات میں شعور سے ماورا
اِک روایت کا بیجان احیا ہے
اگر یہ فسوں ساز طلسم
غلامی در غلامی، تقسیم در تقسیم کا جہاں ہے
تو پھر
اُمید اور یقین سے بھرپور
روشن دن
نئے خواب کا جنوں
خودشناسی کی تعمیر میں چھپا
سورج کہاں ہے؟

امجد بابر

نظم

ایک دوجے کے ہم قدم نکلیں
کوئی نکلے نہ نکلے، ہم نکلیں

پوری طاقت سے چیخیں چلائیں
تا کہ سینے کے سارے غم نکلیں

اہل ایمان کو بشارت ہو
اور اہلِ ستم کے دَم نکلیں

توڑ کر بند ضبطِ پیہم کا
بن کے طوفان مثلِ یم نکلیں

جان دینے کا فیصلہ کر لیں
کھا کے اللہ کی قسم نکلیں

لکھیں ہر واقعہ شجاعت کا
سارے سچائی کے قلم نکلیں

آبرو قوم کی بچانے کو
لے کے ہمراہ سب حرم نکلیں

آج لازم ہوا ہے سیّد بھی
کرنے اک داستاں رقم نکلیں

حسن پرویز سیّد

نثری نظم

ہم کتنا بدل جاتے ہیں

خلوص کی مہک

دنیاداری کے تعفن کا مقابلہ نہیں کر سکتی

زر، مرتبے اور رتبے

کا بوجھ اٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں

عاجزی ہر کسی کا نصیب کہاں

نہ جھکنے والی ٹہنیاں اکثر ٹوٹ جاتی ہیں

لفظ جھوٹ ہیں

جزبے آلودہ

دل خالی

آنکھیں اجنبی

آوازوں کے شور میں خامشی کی پکار دب جاتی ہے

ہر دل تو بینا نہیں ہوتا

بھرم ٹوٹ جائے تو پھر دل کا آنگن

آباد نہیں ہو سکتا

نائلہ راٹھور

حال سے ماضی کی طرف

(1)

شیئر کی ہے جو تو نے اک تصویر
اس میں ہم سب نئے نئے سے ہیں
ایک وہ ہے جو مجھکو چاہتی ہے
ایک وہ ہے جو اس کو چاہتا ہے
میرے پیچھے جو ایک لڑکا ہے
وہی مخبر تھا سارے کیمپس کا
شاید وہ آج کل بھی مخبر ہے
دائیں سے بائیں والا میں ہوں اگر
پھر میرے ساتھ والی تو ہو گی
تیرے ہاتھوں میں تیرا مستقبل
میرے ہاتھوں میں ہجر ہے ترا

(2)

میرے کاندھے پہ میرا بیگ بھی ہے
اور جیبوں میں ہاتھ میں میرے
مجھکو لگتا ہے کچھ نہیں بدلا
وقت کی تیز دھار قلچی نے
اپنی مرضی سے یہ کٹائی کی
اور ہم اپنے اپنے رقبے میں
اپنی ہی کاشت میں مگن ہو کر
بھول بیٹھے ہیں اپنے چہرے کو
شیئر کی ہے جو تو نے اک تصویر
اس نے پھر یاد یہ دلایا ہے
میں بھی مالک تھا ایک چہرے کا
میں بھی عاشق تھا ایک چہرے کا

اعجاز رضوی

خطوط

نسیم سحر

مدیرِ اعلیٰ اور جملہ اراکینِ مجلسِ ادارتِ بیاض۔ احترامات فراواں اور سلام مسنون۔ اپریل کا شمارہ حسبِ معمول وقت پر موصول ہو گیا تھا اور چونکہ رمضان المبارک کے سبب ''بیرونی دورے'' کسی حد تک کم ہو گئے ہیں اس لیے دو دن میں ہی پورا شمارہ پڑھ لیا۔

اس مرتبہ بھی امجد اسلام امجد مرحوم کے بارے میں ان کا دکھ تازہ کرنے والی نظمیں شامل ہیں، مگر اُن کا دُکھ ابھی باسی ہوا ہی کہاں ہے۔ ادبی کائنات پر کئی عشروں تک راج کرنے والے کو اتنی جلدی کون بُھلا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے سایۂ رحمت میں آسودہ رکھے۔

ان کے سمدھی اور ہم عصر شاعر جناب انور مسعود نے جس تعزیتی اجلاس اِس شمارے میں شامل مضمون پڑھا تھا اس میں مَیں بھی موجود تھا اور مجھ سمیت تمام حاضرین میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کی آنکھ اشکبار نہ ہوئی ہو۔

جناب سرور حسین نقشبندی کا خیال افروز مضمون ''نعت حسنِ عقیدت سے جامعاتی علم تک'' تحقیقی حوالوں سے انتہائی اہم ہے، اسے پڑھ کر قندِ مکرر کا سا لطف آیا کہ یہ مضمون انہی کی زبانی لاہور میں ۱۲ مارچ کو ہونے والی دوسری اردو نعتیہ کانفرنس میں بھی سن چکا ہوں۔

کچھ شخصی مضامین دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ مضمون نگار اپنے ''ممدوح'' کو عظمت کے اونچے سنگھاسن پر بٹھانے کے لئے کچھ زیادہ ہی مدّاحی سے کام لیتے ہیں اور بلا تکلف اسے اپنے تمام ہم عصروں سے بلند مرتبے پر فائز کر دیتے ہیں۔ شاید یہ ان کی محبت اور عقیدت کا تقاضا ہو مگر کسی بھی صنفِ ادب میں عظمت یا سرِ فہرست ہونے کا فیصلہ کوئی ایک فرد نہیں کرتا، بلکہ زمانہ کرتا ہے۔ بس اس تھوڑے لکھے کو ہی بہت سمجھ لیجئے۔

عقیدتی شاعری میں سے درجِ ذیل اشعار دل کو لگے:

جو ان کا نام عقیدت سے لکھتا رہتا ہے — عطا ہوئی ہے وہ دانش قلم دوات مجھے — اعجاز دانش

مرے مقام، مرے مرتبے پہ غور کریں — میں مکے اور مدینے سے ہو کے آیا ہوں — نوید صادق

ایک لمحے میں اتر جاتی ہے صدیوں کی تھکن — ہم کہ جس آن تہِ ظلِّ علَم آتے ہیں — حسنین مظہری

کچھ غزلوں کے منتخب اشعار قندِ مکرر کے طور پر:

پریشاں رو، کسی پہلو نہیں تھا — ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا —

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا — لاکھ نیازمند ہیں، ایک اگر نہیں تو کیا — خالد احمد

اک لَو لہو میں شوقِ شہادت کی تھی سو ہم — مقتل میں آپ آئے ہیں، لائے نہیں گئے — جلیل عالی

جب ہوئی اختصار کی درخواست — ہم چلے آئے داستان سمیت — انور شعور

سچ کے سیلِ تند کے آگے کبھی — جھوٹ کے پُل رہ نہیں سکتے کھڑے — راحت سرحدی

کھول رکھا ہے ترے خواب نگر کا نقشہ — اور اِک سبز ردا تان کے چُپ بیٹھے ہیں — خاور اعجاز

پھر شبِ ہجر آنے والی ہے — روشنی آفتاب سے بھر لوں — شاہنواز زیدی

ایک ہی سنگ کہاں سر کی کیفیات کرتا — سو میں دیوار کی دیوار اٹھا لایا تھا — طالب انصاری

ہتھیلیوں سے ڈھلتی عمر کا وبال — سہاگ کی لکیر ہی مٹا گیا — محمد انیس انصاری

ترے جمال کی تصویر بن نہیں پائی — لکھے پڑے ہیں کئی انتساب کاغذ پر — ناصر علی سید

جو اس نے اتنی محبت سے مجھ کو دیکھا ہے — کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہے مجھ میں — صفدر صدیق رضی

یہ بستی کور چشموں کی ہے بستی — انہیں کیا، آفتاب آئے نہ آئے — فراست رضوی

یہ الگ بات شجر سوکھ گیا پت جھڑ میں — وہ ہری ہی رہی جس شاخ پہ طائر ٹھہرا — محمد اشرف کمال

آپ کہاں دیکھیں گے محفل کے دوران — میز سے ایک گلاس گرانا پڑتا ہے — رخشندہ نوید

میں حسنِ لازوال بھی کیسے کہوں تجھے — تو حسنِ لازوال سے آگے کی چیز ہے — افتخار شاہد

ابھی پیڑوں کے نیچے بیٹھتے تھے	کہیں پہ لے کے آرے پھر رہے ہیں	مسعود احمد
وہ یقیناً ہے کوئی پارسا عشق جلیل	جس کے دروازے کھلے ہوں کوئی دربان نہ ہو	احمد جلیل
پڑی دراڑ کہاں اور کہاں تلک جائے	کبھی خبر ہی نہ لی چھوڑ کر مکان میاں	احمد سبحانی آکاش
ایک مینار تھا مسجد کا زمیں بوس ہوا	اک گنبد تھا جو مٹی میں دبا کر لوٹے	رضا اللہ حیدر
مسترد ساری ہوئیں میری دعائیں دانش	کچھ بھی اب یاد نہیں، کب، کہاں، کیا مانگی تھی	دانش عزیز
سراسر ہوں نوشتے کے مطابق	جو سوچے، کچھ نہیں تقصیر میری	فیض رسول فیضان
حساب شاہ اگر کر سکو تو بسم اللہ	فقیر گوشہ نشیں سے شروع ہو جاؤ	شہاب صفدر
نکل سکتے ہیں استصواب رائے سے کئی رستے	عدو کو موت لیکن مسئلے کے حل سے آتی ہے	احمد حسین مجاہد
جسے سورج سمجھتا ہے زمانہ	دہانہ ہے کسی آتش فشاں کا	اکرم ناصر
خوابوں کی کاغذی کشتیاں غرقاب ہو نہ جائیں	ہیں جا بجا یہ بھنور کائنات میں	شاہد ماکلی
ہجر کچھ اس طرح کی ہجرت ہے	ساتھ سامان بھی نہیں ہوتا	عمران اعوان
پتی پتی بکھر نہ جائے کہیں	پھنس گیا ہے گلاب کانٹوں میں	کوکی گل
اس کی خاموش لبی دل کو ڈسے جاتی ہے	اسے دریا نہ کہو جس میں روانی ہی نہ ہو	آفتاب خان
نہ بنی تھی یہ کسی کی نہ ہے بننے والی	پھر بھی ہر شخص یہ کہتا ہے کہ ہائے دنیا	صغیر احمد صغیر
خدا کا شکر ہے واعظ کہ پارسائی میں	تری طرح ہوں نہ آئندہ ہونا چاہتا ہوں	امر مہکی
تو جو کھینچے گول لکیریں	میرے نقش بن جاتے ہیں	سمیرا یوسف
جب تلک پاؤں پانیوں میں رہے	آگ جلتی رہی سمندر میں	محمد نورآسی
تجھے اے دل بھلا ہر طرف سے لینا دینا کیا	ہے نسبت قیس سے تجھ کو بیابانی مبارک ہو	نسرین سید
سمندروں نے بھی ہم سے تو کج روی برتی	تو خود کو ساحل امید پر ڈبونا پڑا	محمد عرفان خان
وہ بھول جائے گی مجھ کو بڑی سہولت سے	میں کیا کروں کہ مرا تجربہ ہی پہلا ہے	امتیاز انجم

جناب اقبال جلالی کی "سفر الٹی کہانی" بار بار پڑھی کہ اس کا نثری نظم کا انداز ہی اتنا دلکش تھا اور اس کی ورود شانہ باتیں ایک مرتبہ پڑھ کر ہم جیسے کم علمی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

دیگر کئی تخلیقات پر بھی کچھ عرض کرتا مگر رمضان کے مہینے میں بس اتنا ہی لکھ سکا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔

سید ریاض حسین زیدی

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحبان!

السلام علیکم!

خدا نظر بد سے بچائے خالد احمد کی۔ شاندار روایات اور ان کی وراثت یعنی بیاض کی ہر آن بہتر سے بہترین اشاعت کو آپ نے نہ صرف قائم رکھا ہے بلکہ ہر آنے والی گھڑی اس کی مزید خوبصورتی کا اعلان کرتی آ رہی ہے۔

میں معترف ہوں کہ آپ نے حمد و نعت کی نگارشات کو دنیا کے ہر ادبی پرچہ کے مقابلے میں نمایاں مقام بخشا ہے۔ اشرف نقوی کی حمد اور دیگر نعت گو حضرات کی عالیہ اشاعت نے فروغ نعت کے سلسلے کو تقویت بخشی ہے۔ خوشی ہے کہ جناب عمران منظور کو فروغ نعت ایوارڈ ملا ہے۔ جو بیاض میں اشاعت پذیر نعتوں کا ثمر ہے۔ بیاض نے جناب محمد ارشاد کے افکار عالیہ کو اپنی اشاعت میں ممتاز مقام دے کر ارشاد نوازی کا حق ادا کیا ہے۔

م۔ م مغل نے شبیر نازش، عادل۔ سعید قریشی نے ناصر بشیر کی سفرنامہ نگاری اور حافظ محمد طلحہ غفور نے فیصل زمان چشتی کی شاعری کے فکر و فن کا خوبصورت احاطہ کیا ہے۔ نہایت محترم دوست ذکا اللہ! نجم ملغانی نے بڑی محنت سے عالمی شہرت یافتہ نعت گو اور نعت نگار علی رضا کو دل کھول کر داد دی۔ لیکن بیاض نے کمال کیا کہ علی رضا کی تصویر غائب کر دی اور ان کی جگہ علی رضا احمد کو بٹھا دیا۔ یہ نادانستہ غفلت اس لیے معاف کی جاتی ہے کہ علی رضا کی جگہ دوسروں کی لاکھ تصویریں لگا دی جائیں۔ لیکن علی رضا کو جاننے پہچاننے والے ان کو ہزار پردوں میں چھپنے کے باوجود ان کے شعری کمالات کے ہمیشہ مداح رہتے ہیں:

وہ علی رضا ہے اور یہ علی رضا ہے اور
سلیم احمد سلیمی کی غزل کے مطلع اول:

وقت اگر پڑنے پر اگر کام نہ آئے دنیا
ایسی دنیا ہے تو پھر بھاڑ میں جائے دنیا

نے اماری داد کو بھرپور انداز سے سمیٹا ہے۔ فخر عباس کی غزل کا بھی پاک باز مطلع روحانی کیف کے حصے لا گیا

عید کی دن بھی جسے یاد خدا کی آئے
اس کے اندر سے مہک کیوں نہ وفا کی آئے

وقت کی کمی اور اختصار کی جمدار جلد متوقع آمد کی بنا پر بیشتر نگارشات پر تبصرے کے جملہ حقوق محفوظ رکھتا ہوں۔ تاہم سب کو ان کی علمی، ادبی اور شعری کاوشوں پر سلام

ہے بیاض فکر و فن کا معترف سارا جہان
ہے مجھے منظور کہ اعجاز رضوی سا کہوں

فیض رسول فیضان

مخدومی عمران منظور صاحب، محترمی نعمان منظور صاحب، مکرمی اعجاز رضوی صاحب، آداب!
اپریل کا بیاض، کتاب، پھولوں اور پرندوں کے سادہ رنگ کا ٹائٹل کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ قتیل شفائی یاد آئے:

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

ویسے دوسرے اینگل سے، یہی ٹائٹل ایک ایسے امکانی و مثالی معاشرے کی بھی بلیغ نشان دہی و سمت نمائی کر رہا ہے جہاں کتاب کی حکمرانی، پھولوں کی راجدھانی اور پرندوں کی آسودہ و آزاد اڑان سے جنت ارضی کی تشکیل کا سامان کر دیا جائے۔ بہر حال خوب است!
جنگل میں رنگل، ٹائٹل کے منفرد و لطیف نام نے توجہ کھینچتے ہوئے اپنا ایک مطلع یاد دلوایا:

کرسیوں پہ بیٹھ کے جنگل میں منگل دیکھیے
آیئے گونگے پہلوانوں کا دنگل دیکھیے

ٹائٹل ورق پر چاہ کی نوشتہ پنہاں اور ستاروں کی اصاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں، کی پہلو دار کیفیت، تہذیبی زوال کا تخلیقی اظہار ہے۔ ڈھیروں داد۔ خالد احمد کی افتتاحیہ غزل، با کمال و لاجواب ہے۔ خصوصاً یہ شعر تو مست ہیں:

کتنے کاغذ راکھ ہوئے ہیں
ایک تمنا کیا پوری کی

سانس کی ڈوری ٹوٹ نہ جائے
بات چلی ہے پھر ڈوری کی

حمد، نعت، منقبت اور تصوف کے مستقل سلسلے ایمان افروز اور بصیرت آموز ہیں۔ جمیل یوسف کی جوابی غزل میں محمد ارشاد نے اردو اور فارسی علم و ادب اور شعر و سخن کے دریا بہا دیئے ہیں۔ اور اس تبحر علمی کے سود و بہبود کا سارا کریڈٹ جمیل یوسف کو جاتا ہے۔ ویسے یہاں تو صرف دو بڑوں کی بات ہے، غالب نے تو تقریباً سوا سو شارحین کو وقتاً فوقتاً الجھا رکھا ہے اور ہنوز تکرار تھمی نہیں ہے۔ دم۔ اپنا ایک قطعہ یاد آیا:

ورائے عرش رسا تخیل آڑان ہے اس کی
وہ شہ کلید شہر خانہ مطالب ہے

سخنوران زمانہ ہیں معترف فیضان
ہر ایک دور پہ غالب ہنوز غالب ہے

امجد اسلام امجد کے بارے میں انور مسعود کا مختصر و جامع مضمون، صداقت و لطافت کا مرقع ہے۔ دونوں کا ایک ایک قابل قدر شعر:

سکوں محال ہے امجد وفا کے رستے میں
کہیں چراغ جلے ہیں ہوا کے رستے میں

بڑے نمناک سے ہوتے ہیں انور قہقہے تیرے
کوئی دیوار گریہ ہے ترے اشعار کے پیچھے

نجیب جمال نے آل احمد کی غزل کا شاندار و جاندار تجزیہ کیا ہے۔ آل احمد صاحب کا ایک زندہ شعر:

نظر جلا کہ مرا حوصلہ جوان رہے
سکوت شہر! ترے سامنے کھڑا ہوں میں

حامد یزدانی نے عظیم فلسفی شاعر، شہزاد احمد پر بیاد آفریں اور وجدان پرور تحریر پیش کی ہے۔ جناب شہزاد کا ایک لازوال شعر:

شہزاد مانگتا ہے دعا سب کے واسطے
کس طرح اپنی ذات کو سب سے جدا کہوں

امیر حسین جعفری نے اختر حسین جعفری کے شعری اسلوب پر ادبی رچاؤ کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ بقول غالب:

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

کے مصداق اختر حسین جعفری ایسے غیر معمولی تکلم گو ہیں کہ جن کی تفہیم و دریافت کے لئے اردو ادب کو حالی جیسے کسی بہت بڑے نقاد کا انتظار ہے۔
دیگر نثری مضامین میں صوفیہ بیدار پر ناصر نقوی کے انتقادی شذرے سے پتہ چلتا ہے کہ موصوفہ توجہ طلب اور قابل مطالعہ افسانہ نگار ہیں۔
ثاقب ندیم کی نظموں پر شاہد اشرف کا تجزیہ موصوف کی وسعت مطالعہ پر شاہد ہے۔ سرور حسین نقشبندی کی نعت نگاری و یہ مثال اب قابل رشک، حوالہ بن چکی ہے۔ موصوف کو ڈاکٹریت کی بے حد مبارکباد۔ جان کی امان النعت کانفرنس کی اذیت یاد آ جاتی ہے۔ حضرت ادیب رائے پوری مالکی ان عظیم کو نعت بہت پہلے منعقد کر چکے ہیں۔
ڈاکٹر اشفاق ورک کی تحقیقی کتاب "مجالس" پر بدیہ تبریک ہے۔ عمیرہ احمد کا انٹرویو محترم کو خراج تحسین، حقیقت آمیز ہے۔ دیگر حصے بھی معیار یافتہ جاذبیت لئے ہوئے ہیں مگر طوالت کے پیش نظر قلم روکتا ہوں۔ ایک تازہ غزل کے ساتھ اجازت۔ والسلام!

بوجہ مجبوری آئندہ شمارے میں خطوط کا سلسلہ موخر کیا جا رہا ہے۔ فکری اور علمی موضوعات کے خطوط ضرور شامل کیے جائیں گے۔ [ادارہ]

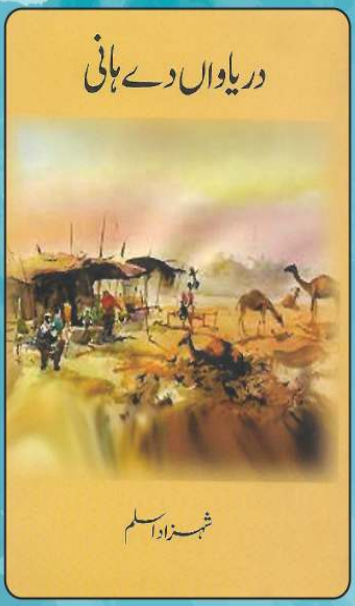

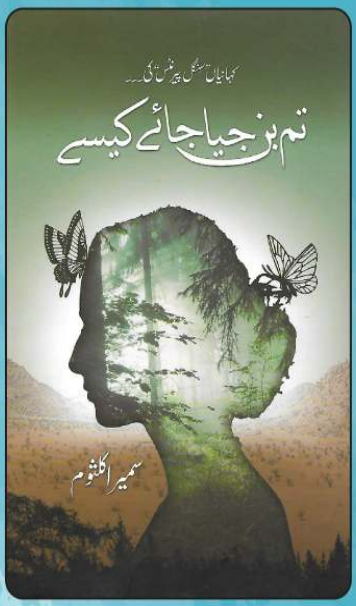

کہانیاں سنگل پیرنٹس کی۔۔۔
تم بن جیا جائے کیسے
سمیرا کلثوم

دریاواں دے ہانی
شہزاد اسلم

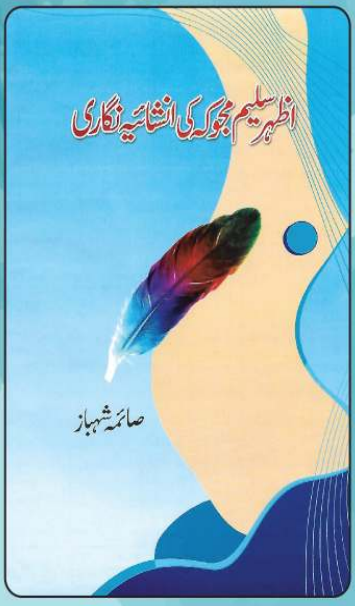

MAJAAL
URDU POETRY
مَجَال
ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

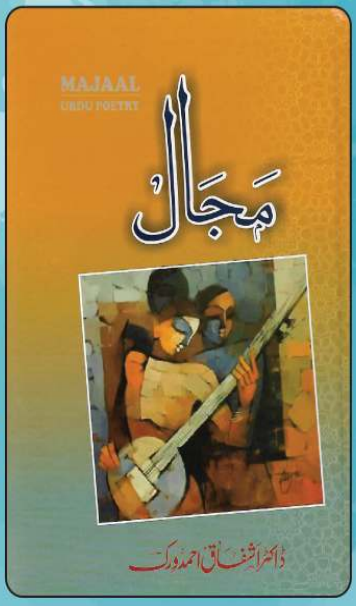

اظہر سلیم مجوکہ کی انشائیہ نگاری
صائمہ شہباز

جناب خالد احمد، جناب امجد اسلام امجد

جناب شہزاد احمد، جناب ناصر زیدی، جناب اے جی جوش
جناب نجیب احمد، جناب عطاالحق قاسمی

جناب عزیر احمد، جناب خالد احمد، جناب مرتضیٰ برلاس
جناب امجد پرویز، جناب آغا نثار، جناب عمران منظور

ڈائریکٹر الحمرا آرٹ کونسل، جناب عطاالحق قاسمی،
جناب ظفر اقبال، جناب سرور حسین نقشبندی

جناب عمران منظور، جناب نجیب احمد، جناب جمشید چشتی
جناب افتخار عارف، جناب خالد احمد

جناب عمران منظور، جناب شوکت علی شاہ، جناب عقیل روبی